شمس منیری

—— از ——

پروفیسر حافظ شمس الدین احمد، ایم اے بی ایل، شمس منیری

سابق صدر شعبۂ اردو، پٹنہ کالج و یونیورسٹی

قیمت عہ/

باز گلبانگ پریشاں می زنم
آتش اندر عندلیباں می زنم

(عرفی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

تقریب

ہر چیز اپنے آغاز کی تاریخ رکھتی ہے۔ "گلبانگ" کے آغاز کی بھی ایک تاریخ ہے۔ پچھلے سال زیارت حرمین شریفین سے واپسی پر جناب پروفیسر شمس منیری کے دولتکدہ پر اتفاقاً ایک چھوٹی سی مجلس مشاعرہ ہوئی، جس میں یہ خاکسار، جناب جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور اختر اورینوی بھی شریک تھے۔ جناب شمس نے اپنی وہ مسلسل غزلیں سنائیں جو دوران سفر حج و اقامت مدینہ طیبہ میں مرتب ہوئی تھیں۔ یوں ہم میں سے ہر شخص ان کی حسن طبیعت اور مشق سخن سے واقف تھا، مگر ان کا یہ کلام سن کر ہم سب لوگوں نے بالاتفاق اس بات پر اصرار کیا کہ جناب شمس اپنے سارے کلام کو جلد از جلد اکٹھا کر کے شائع کرا دیں۔ اس سے نہ صرف اُردو ادب پر احسان ہوگا بلکہ صوبہ بہار کے ادبی سرمایہ میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔ چنانچہ اسی اصرار کا نتیجہ ہے کہ آج "گلبانگ" کو پیش کرتے ہوئے مجھے مسرت ہو رہی ہے اور ایک احساس عزت افزائی کے ساتھ میں اس کی تقریب لکھ رہا ہوں۔

جناب شمس سے میرا رشتہ شاگرد و استاد کا نہیں ہے۔ میں ابتدا سے عربی کا طالب العلم رہا، اور فارسی اور اُردو کے اساتذہ سے مجھے فیض اندوزی کا موقع نہیں مل سکا۔ پھر بھی پٹنہ کالج کے اساتذہ میں بعض مغتنم ہستیاں ایسی

تھیں جنہیں میں استاد کے برابر احترام کی نگاہ سے دیکھتا آیا ہوں۔ ان میں جناب شمس منیری اور حضرت بیدل عظیم آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن جناب شمس سے دو جہتیں اور بھی بڑھ گئی ہیں، ایک تو یہ کہ میں شعبہ اُردو میں ان کے ساتھ کئی سال تک کام کرتا رہا، دوسرے یہ کہ تقریباً چھ سال سے میں ان کے پڑوس میں رہتا ہوں۔ ان دو جہتوں نے مجھے ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع دیا، اور میں یہ کہنے میں ذرا جھجھک نہیں محسوس کرتا ہوں کہ جناب شمس نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب ہیں، بلکہ اخلاق عالیہ کے بھی حامل ہیں۔ اگرچہ ان کی ابتدائی نشو و نما اور تعلیم و تربیت گوالیار میں ہوئی۔ لیکن ان کا آبائی وطن قصبہ منیر شریف، ضلع پٹنہ ہے۔ یہ وہی منیر ہے جس کی خاک پاک سے حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری ثم بہاری قدس سرہٗ اُٹھے۔ اس انتساب سے جناب شمس منیری کی ذات بھی شرفیاب ہوئی۔

جناب شمس پہلے پہل مظفر پور کالج میں فارسی و اُردو کے معلم مقرر ہوئے جہاں بابو اودھ بہاری سنگھ آنجہانی، ایک صوفی منش بزرگ، اور اُستاذ عربی و فارسی کی صحبت سے مستفید ہوئے۔ پروفیسر عبد الماجد صاحب اختر اور پرنسپل رام پرشاد کھوسلا ناشاد سے بھی علمی و ادبی صحبتیں گرم رہیں۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد راونشا کالج کٹک میں قانون کے پروفیسر ہوگئے اور کئی سال تک وہاں اس حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن ان کا فطری رجحان ادب کی طرف تھا، اس لئے موقع ملتے ہی پٹنہ کالج چلے آئے، اور عظیم آباد کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ مگر یہ فطری طور پر مشاعروں کے لئے غزلیں لکھنے اور مشاعروں میں غزلیں پڑھنے سے پرہیز کرتے رہے۔ ان کی کسی شاعر سے چھیڑ چھاڑ، چشمک نہیں رہی، بلکہ اس دور کے صف اول کے عظیم آبادی شعراء

انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں جناب ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی وہ تضمین پیش کی جاسکتی ہے جو انہوں نے جناب شمس کی ذیل کی غزل پر کی ہے ؎

اپنے بیگانے ہوئے اے جانِ جاں تیرے لئے
بن گئے دشمن زمین و آسماں تیرے لئے

جناب شمس کا ادبی شعور پختہ اور رچا ہوا ہے۔ ان کے الفاظ میٹھے، نرم اور مترنم ہیں، جن سے ان کا احساس موسیقی اجاگر ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں اپنی آغوش میں ایک نئی شان تغزل لئے ہوتی ہیں۔ غزلوں کے علاوہ انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور کچھ قطعات و رباعیات بھی۔ لیکن کہیں تصنع اور بناوٹ سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کے اشعار پڑھتے چلے جایئے، کہیں اس کا احساس نہ ہوگا کہ زبردستی رعب دار ترکیبیں لائی گئی ہیں، اور جان بوجھ کر طنطنہ انگیز الفاظ منتخب کئے گئے ہیں۔ خیالات و جذبات کا دریا ہے کہ نرمی کے ساتھ مدھم سروں میں لہریں لے رہا ہے۔ ایک چیز جو جناب شمس کو اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری روایتی نہیں، بلکہ تجرباتی ہے۔ ان کی غزلوں میں صرف باطنیت ہی نہیں ملتی، بلکہ وہ جس دنیا میں زندہ ہیں، اس کی نیرنگیوں کے شاہد بھی مل جاتے ہیں۔ وقت کے تیور پہچاننا اور اپنے ماحول کی ترجمانی کرنا آسان نہیں اس میں بہت سی کٹھنائیاں ہیں، اور انہی کٹھنائیوں پر قابو پانا تکمیل فن کی نشانی ہے۔ ان کے کلام میں ہم زندگی، بیسویں صدی کی زندگی، ہندوستانی زندگی، مجبور، بےکس، افلاس زدہ زندگی کا نقش ابھرا ہوا پاتے ہیں۔ کہیں کہیں معاشرتی بدحالی، سماجی پراگندگی اور اخلاقی ابتری کی طرف بھی دبی زبان سے اشارے کر جاتے ہیں۔ ایمائی انداز میں کچھ کہنا، اور کہے ہوئے سے زیادہ ان کہی باتوں کی

عرضِ مصنّف

حیاتِ شکستہ کی تعبیر ہے یہ
رگِ جانِ شیریں کی تحریر ہے یہ

ہر اک ایک حرف اس کا افسانۂ دل
کتابِ محبّت کی تفسیر ہے یہ

جوانی تھی میری کہ اک خوابِ رنگیں
اُسی خوابِ رنگیں کی تعبیر ہے یہ

کہیں خونِ دل سے ہے لالے کا تختہ
کہیں زعفران زارِ کشمیر ہے یہ

گلستانِ معنی کی گلبانگِ رنگیں
نواہائے خونیں کی تاثیر ہے یہ

اسے دیکھ کر مجھ کو کیا دیکھتے ہو
بڑھاپے سے پہلے کی تصویر ہے یہ

چکا چوند ہیں دیکھ کر سب کی آنکھیں
کہ شمس منیری کی تنویر ہے یہ

(شمس منیری)

SHAMS

تعارُف

حضرت حافظ شمس الدّین احمد شمسؔ منیری اور ان کی شاعری

حافظ شمس الدین احمد نام، شمسؔ تخلّص، وطن منیر شریف (ضلع پٹنہ، صوبہ بہار)۔ سنہ پیدائش ۱۸۹۶ء۔ مقام پیدائش موضع بلھوری (ضلع پٹنہ)۔ ابتدائی تعلیم و تربیت آپ کے والد مرحوم جناب مولوی ضمیر الدین صاحب منیری کے زیر نگرانی ریاست گوالیار میں ہوئی، جو وہاں بحیثیت انجینیر ملازم تھے۔ جناب مولوی صاحب موصوف صاحب ذوق بزرگ تھے، شعر و شاعری اور علم و ادب کا بڑا شوق رکھتے تھے۔ آپ کو شاہنامہ فردوسی سے خاص شغف تھا۔ اس نگاہ ترتیب کے زیر سایہ جناب حافظ صاحب کو ادب و شعر کا نہایت عمدہ ماحول ملا۔ حروف شناسی اور ابتدائی خواندگی کے بعد اُردو کی پہلی کتاب جو ہاتھوں میں آئی وہ شاہنامہ فردوسی کا منظوم ترجمہ (اُردو) تھا۔ حضرت شمسؔ منیری کے والد صاحب کو مردانہ اشغال، ورزش اور سیر و شکار سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے جناب حافظ صاحب کو بھی ورزش سکھائی اور شکار کا شوق دلایا۔

جناب مولوی ضمیر الدین صاحب منیری کے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد حافظ صاحب کی انگریزی تعلیم پٹنہ میں شروع ہوئی۔ آپ نے کلکتہ یونیورسٹی کا میٹریکولیشن امتحان ۱۹۱۱ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ پٹنہ ڈویژن میں بحیثیت مجموعی اور فارسی میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے، انعامات اور وظائف ملے۔ انٹرمیڈیٹ آرٹس (کلکتہ یونیورسٹی) کا امتحان پٹنہ کالج سے

فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا، اور صوبہ بہار میں اوّل آئے۔ بی اے کا امتحان
(الٰہ آباد یونیورسٹی) وکٹوریا کالج گوالیار سے پاس کیا اور کالج میں اوّل آئے
حکومت گوالیار سے علی گڑھ میں قانون کی تعلیم کے لئے وظیفہ ملا۔ چند مہینے وہاں
تعلیم حاصل کی، مگر کالج کے اسٹاف اور ٹرسٹیوں کے جھگڑے کی وجہ سے
وہاں کی اقامت ترک کی اور تعلیم قانون کی تکمیل پٹنہ کالج سے ہوئی۔ اُسوقت
تک پٹنہ یونیورسٹی کا قیام ہوچکا تھا۔ لہذا بی۔ ایل کی ڈگری جامعہ پٹنہ سے ملی۔
پھر فارسی میں پٹنہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے کا امتحان دیا اور فرسٹ کلاس میں پاس
کیا اور جامعہ میں اوّل رہے۔ جامعہ کا انعام اور طلائی تمغہ ملا۔

جناب حافظ صاحب کی طبیعت ابتداہی سے موزوں تھی۔ ہم صحبتوں کے
ساتھ دلچسپی کے لئے کھیل کھیل میں اشعار پیش کر دیے جاتے تھے۔ تعلیمی زندگی
میں بھی شعر و شاعری کا مشغلہ جاری رہا۔ پٹنہ کالج میں ہم سبق حضرات عبدالمنان
بیدل، سلطان الدین حسین سلطان اور رضا ہمدانی جیسے اہل سخن کا ساتھ تھا۔
ذوق سخن پرورش پاتا رہا۔ گوالیار میں بھی حضرت مضطر خیرآبادی سے اکثر صحبت
رہی۔ حضرت سائل دہلوی سے بھی نیاز حاصل ہوتا رہا۔ پروفیسر احسن اللہ خاں
ثاقب اکبرآبادی سے بی۔ اے کلاسوں میں تلمذ رہا۔ مگر فن شاعری میں کسی کی
شاگردی نہیں کی۔ تبرکاً ایک غزل شاہ سید احتشام الدین حیدر مشرقی میری
قدس سرہٗ کو دکھائی تھی، ایک دوسری غزل جناب نواب فصاحت جنگ بہادر
حضرت جلیل مانکپوری مرحوم کے پاس بذریعہ ڈاک بھیجی تھی، جناب نے پسند
فرماکر واپس کی۔ ڈاکٹر اقبال کے پاس بھی ایک چھوٹی سی فارسی نظم بھیجی تھی،
انہوں نے پسند فرماکر تعریفی خط لکھا۔ تکمیل تعلیم کے بعد جناب حافظ صاحب نے
سنہ ۱۹۲۱ سے سرکاری ملازمت شروع کی۔ جی۔ بی۔ کالج مظفرپور میں اردو

وفارسی کے لکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں جب کہ ریونشا کالج، کٹک (اڑیسہ) میں بحیثیت لکچرار قانون تبادلہ ہو گیا۔ ۱۹۲۷ء میں پھر کٹک سے پٹنہ کالج میں بحیثیت لکچرار اردو و فارسی تبادلہ ہوا۔ اور بقیہ مدت ملازمت یعنی تقریباً چوبیس سال یہیں گذار کر ۱۹۵۱ء میں ملازمت سے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ سبک دوش ہوئے۔ پٹنہ کالج میں حضرت علامہ عظیم الدین احمد پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مرحوم، حضرت عبدالمنان بیدل، پروفیسر علامہ عبدالمجید صاحب وغیرہ ہم نواؤں اور دوستوں کا ساتھ رہا۔ سبک دوش ہونے کے وقت آپ شعبۂ اردو اور بزم ادب پٹنہ کالج کے صدر تھے۔ کرسیٔ صدارت پر آپ عرصہ تک فائز رہے۔ آپ یونیورسٹی کے مختلف اردو بورڈوں کے بھی صدر رہے۔

جناب شمس منیری کو درس و تدریس اور شعر و شاعری کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی شغل رہا۔ کلام نظیر اکبرآبادی کا انتخاب بنام اشعارِ نظیر نہایت قیمتی انتقادی تمہید کے ساتھ شائع ہوا۔ ہمایوں بادشاہ اور اکبر الہ آبادی کے کلام کے متعلق تحقیق و تفتیش کے کام بھی ہوتے رہے اور اس سلسلہ کے مقالے رسالہ معاصر پٹنہ میں جستہ جستہ شائع ہوتے رہے۔ ان کے علاوہ اور بھی فکر انگیز تنقیدی مقالے رسالہ معاصر اور بعض دیگر رسائل میں شائع ہوئے بعض طلبا اور لکچرار حضرات جو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے ریسرچ میں مصروف تھے، اُن کے کاموں کی نگرانی بھی جناب حافظ صاحب کے سپرد رہی۔

جناب حافظ صاحب نے درس و تدریس سے سبک دوش ہونے سے پہلے ۱۹۵۰ء میں سفر حج کیا، اور زیارت بیت اللہ و مسجد و مزار نبوی کا شرف حاصل کیا۔ اس سفر کے تاثرات نے متعدد نظموں کی شکل اختیار کی۔ یہ نظمیں

'پیام و سلام' کے باب میں شریک دیوان ہیں۔
اس مجموعہ میں مشاعروں کی بھی کچھ غزلیں ہیں، مگر کلام کا اکثر حصہ ذاتی تجربات کا نتیجہ ہے۔ بہت سی غزلیں کسی خاص موضوع پر ہیں اور اشعار مسلسل و مربوط ہیں۔ وہ گویا حقیقت میں نظمیں ہیں، مگر صوری اعتبار سے غزلیں ہیں۔
شاعری میں آپ بیتی ہو یا پر بیتی جب تک وہ دل بیتی نہ بن جائے۔ تاثیر اس کے پاس بھی پھٹک نہیں سکتی۔ شمس منیری کے یہاں آپ بیتی زیادہ تر ہے۔ وہ واقعی اور خیالی دونوں طرح کے تجربات کو جذبی و تخیلی رنگ بخشتے ہیں۔
معاملات محبت کے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں وہ خیالی کم اور واقعی زیادہ ہیں، اور اُن کی واقعیت ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔ ہجر و فراق کی تکلیفوں کا ذکر، اور تغافل و جفا کاری کے شکوے کم ہیں۔ کامیاب محبت کا نشہ اور سرور اکثر و بیشتر ہے۔ ہر چند کہ حضرت شمس کے یہاں ناکام محبت کا سوز بھی ہے۔ لیکن اُن کی دلو لہ خیز طبیعت کبھی بھی قنوطیت کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ وہ فانی کی طرح دردِ الفت کے سوگوار نہیں، نہ وہ غم جاناں یا راہ وفا میں موت کو اپنا نصب العین بناتے ہیں۔ بلکہ وہ اصغر کی طرح نشاط محبت کے نغمہ سنج ہیں۔ اُن کی غزلوں میں ذوق و شوق اور کیف و سرور کا نمایاں اثر پایا جاتا ہے۔ غم جاناں کے ساتھ غم دوراں بھی شمس منیری کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ لیکن حوادث یا اپنوں کی مخالفت کے طوفان بھی انہیں متشائم نہ بنا سکے
شمس منیری کو مناظر فطرت سے ہمیشہ فطری لگاؤ رہا ہے۔ منیر شریف دریائے سون اور دریائے گنگ کے سنگم پر واقع ہوا ہے۔ پٹنہ بھی عین ساحل دریائے گنگ پر ہے۔ سلسلۂ بندھیا چل کے ہرے بھرے کہستان، گوالیار

کے کہسار، وروادیاں، جنوبی بہار کے شاداب سنگستان، چشمے اور آبشار اپنے دامن میں رنگ رنگ مناظر کی بہار لیے ہوئے ہیں۔ سیر و شکار کے شوق نے اکثر پہاڑوں کے دامن اور جنگلوں کے آغوش میں بسر کرائی۔ ان کیفیات نے شمس کی شاعرانہ طبیعت کو متاثر کیا ہے۔ مختصر یہ کہ پیش نظر مجموعہ شمس منیری کے اوراق زندگی کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ شاعر نے خود کہا ہے ؎

حیات شکستہ کی تعبیر ہے یہ ۔۔۔ رگ جان شیریں کی تحریر ہے یہ

مقدمہ نویس حضرت شمس منیری کے حلقۂ درس میں شریک رہ چکا ہے، اس طرح اسے شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ نیز اسے سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۵۱ء تک شعبۂ اردو پٹنہ کالج میں موصوف کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملتا رہا۔ شعبۂ اردو اور بزم ادب کی قیادت حضرت شمس کے سپرد رہی، اور نیابت اس ناچیز کے سپرد۔ میں نے حضرت منیری کو ایک شفیق استاذ پایا۔ مجھے ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے مواقع حاصل رہے ہیں۔ آپ کی ادبی زندگی سے بھی آپ کے حلقہ نشینوں نے فیض پایا۔ حضرات علامہ عظیم عظیم آبادی مرحوم، عبدالمنان بیدل عظیم آبادی، اور حافظ شمس الدین احمد شمس منیری پٹنہ کالج کی تثلیث شعر و ادب کے اقانیم ثلاثہ ہیں۔ ان لوگوں نے نوجوانوں میں نئی روح پھونکی، اور خاک نشینوں کو پر پرواز عطا کیا۔ کلیم الدین احمد، پرویز شاہدی، رضا نقوی، محسن عظیم آبادی، عطا کاکوی، اختر قادری، صباح الدین وغیرہم آسمان اردو کے وہ طیور ہیں، جن کو انہیں مسیحا نفسوں سے رفعت پرواز حاصل ہوئی۔

حضرت شمس منیری کی زندگی کی خاص خاص باتیں بیان کرنے کے بعد اب میں آپ کی شاعری کی خصوصیات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک شمس منیری

کی شاعرانہ انفرادیت کے محور کے دو قطبین ہیں: لطف زبان اور ترنم۔ حضرت شمس کی آواز سیکڑوں ہزاروں میں صاف پہچانی جاتی ہے۔ سادگی، صفائی، سلاست، فصاحت، برجستگی اور موزونیت، نزاکت و لطافت آپ کی زبان کی خصوصیات میں سے ہیں۔ نازک اور بلند مضامین کو برتتے ہوئے بھی آپ کی زبان اپنے قرینے اور سلیقے سے علیحدہ نہیں ہوتی۔ اشعار میں دلکش ترنم اور غزل کی کیفیات کا لطف فردوس گوش ہوتا رہتا ہے۔ شیریں مترنم الفاظ، تراکیب اور بحور کے انتخاب میں حسن نظر کا ثبوت دیتے ہیں۔ آپ اکثر مخصوص مترنم بحروں میں غزل سرائی کرتے ہیں، اور یوں عام طور پہ بھی آپ کے اشعار میں روانی اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ شیریں الفاظ اور مترنم قافیہ و ردیف کا لطف بھی کلام میں خوب خوب پایا جاتا ہے۔ لطف زبان دیکھئے:

بات اس لب سے جو نکلے گی مزے کی ہوگی ٭ تلخ گفتار سہی، ذائقہ میٹھا ہوگا

کٹھن تھا رستا کڑی تھی منزل، مگر جو ہادی تھے حضرت دل
نہ کوئی اٹکا، نہ کوئی بھٹکا، نہ کوئی بھولا، نہ کوئی چوکا
تری زباں ہے زبان دہلی، ترا بیاں ہے بیان فطرت
کبھی نہ بھولیں گے اہل دہلی مزا تری شمس گفتگو کا

خود نمائی میں بڑے ہو کے سوا ہو جانا ٭ بت ہو طفلی میں جوانی میں خدا ہو جانا

وہ بڑی دھوم سے اک شوخ پہ آنا دل کا ٭ ہائے وہ عہد جوانی، وہ زمانا دل کا!

بجھ وہی جانتے ہیں جن کو لگا ہے یہ روگ　　دل لگی لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا
جو حیا سے نہیں ہوتی ہیں برابر نظریں　　انہیں نظروں سے تو مشکل ہے بچانا دل کا

تھا عجب سوز و ساز بزم وصال　　ہر نظر شمع، ہر نفس مئے ناب

جان آ گئی ہے لعل کے ٹکڑوں میں کہاں سے؟　　اللہ! تمہارے لب شاداب کا عالم

یوں تو ہیں سب کی نگاہوں میں یہ پیاری آنکھیں
کوئی دیکھے مری آنکھوں سے تمہاری آنکھیں

وہ کیا رنگ چمن دیکھیں خود ان کے رنگ کیا کم ہیں
جوانی کی بہاروں میں گلستاں ہوتے جاتے ہیں
ہمیں معلوم ہے کیا حشر ہوگا اُن کے وعدوں کا
کہ وعدے کرتے جاتے ہیں پشیماں ہوتے جاتے ہیں

نہیں مانتا یہ کسی طرح دلِ نابکار کو کیا کروں
تری چشم مست کو کیا کروں لب میگسار کو کیا کروں
غم دہر کا میں رہا ہدف ہوئی عمر ساری یونہیں تلف
ہے چمن میں لالہ سبو بکف، اثر بہار کو کیا کروں

مندرجہ بالا اشعار کی نغمگی و موسیقی بھی بڑی پر تاثیر ہے۔ بحروں کے ترنّم

کو سب و لہجہ کی نغمگی اور دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ اب غنائی کیفیات سے لطف خاص حاصل فرمایئے:۔

ہر شے میں تجسس حسن کا ہے، کیا آنکھ ہے میری کیا کہیئے
کمبخت کو صورت دیکھنے سے ہوتی نہیں سیری، کیا کہیئے

وہ جوش جنوں، وہ شورش دل، وہ ٹھوکریں راہ الفت میں
وہ اپنی جوانی دیوانی، وہ رات اندھیری کیا کہیئے

آخری شعر کتنا مکمل، مصور اور مترنم ہے!۔ تصویر میں خارجی نقوش کے ساتھ داخلی نقوش بھی موجود ہیں۔ یہ شعر ادب العالیہ میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

جو پیڑ کل تک تھے خشک اُن میں نئے شگوفے نکل رہے ہیں
ہوائیں پھاگن کی چل رہی ہیں، جہان کی رت بدل رہی ہے

مجھے لالہ و گل سے غرض نہیں کچھ، ترے سنبل و سرو سمن کی قسم
ترے عارض رشک چمن کی قسم، تری زلف شکن بہ شکن کی قسم

جو جلائے تجھ کو تو آگ ہے، جو دکھائے راہ تو روشنی
فقط ایک فرق مجاز ہے، وہی نور ہے وہی نار ہے

اس شعر کی غنایت کے ساتھ معنویت توجہ کش ہے۔ ایک بڑے نازک مضمون کو کس فن کارانہ خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے!

جانے کیا جا کے صبا کان میں کہہ آئی! | پھول ہنستے ہیں، چمن جھومتا آمادہ ہے
کس مسیحا کی یہ آمد ہے؟ کہ ملنے کے لئے | روح بیمار محبت کی نکل آئی ہے

سمجھتا کاش! کوئی ساقیٔ فطرت کے ایما کو   سحر کو شاخِ گل کے ہاتھ میں پیمانہ ہوتا ہے

پھر صبا لائی تری زلفِ معنبر کی لپٹ   اس نے پھر چھیڑ نکالی ترے دیوانے سے

حضرت شمسؔ کی شاعری میں موسیقی کی مختلف قسمیں ملتی ہیں۔ غنائی نیرنگی اور تنوع کا لطف نہایت ہی دلکشا ہوتا ہے، جیسے کسی خوش ذوق نے چمن آرائی کی ہو۔ رنگ برنگ پھولوں کے تختے، پنکھڑیوں کی نوع در نوع وضع، بندش و ترتیب، نشست و تنظیم اپنے دامن میں لئے، نظر نواز، نکہت بار اور عطر فشاں ہوتے ہیں۔ لطفِ زبان اور کیفِ موسیقی کے ساتھ ساتھ پُر اثر محاکات اور مصوری کے جلوے بھی نظر آتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

ہونٹوں میں تبسم کلیوں کا، گالوں میں لالی پھولوں کی!
کچھ پھول ادھر بھی دیتی جا، او بیچنے والی پھولوں کی
اُف! باغِ حسن میں اُس بت کے کیا کیا ہیں بہاریں کیا کہئے
تن میں ہریالی سبزے کی، گالوں میں لالی پھولوں کی
کنجوں کے اندھیرے میں روشن پھولوں کے دیئے کر ڈالے ہیں
باغوں میں منائی فطرت نے کیا خوب دوالی پھولوں کی

شمسؔ کے فن میں صرف خارجی نقاشی نہیں، بلکہ داخلی مصوری بھی پائی جاتی ہے اور یہی صفت اُن کی شاعری کو معنویت اور وسعت سے ہم کنار کر دیتی ہے۔

مرے تن من کو پھونکے ڈالتی ہے دل کی چنگاری
یہ میری مشتِ خاکستر مرا حاصل نہ بن جائے

مژدۂ فصلِ بہاری پھر صبا لانے کو تھی
پھر وہ اک ہلکی سی شورش ان کے دیوانے کو تھی
باغ میں ہر شے پہ تھا اک کیف سا چھایا ہوا
کھل چلے تھے پھول، کلیوں کو ہنسی آنے کو تھی

نو مشقِ ناز ہے نگہِ سحر فن ابھی
سفاک اور ہو گا وہ ناوک فگن ابھی
کم کم کھلا ہے لالۂ خونیں کفن ابھی
پوری بہار پر نہیں آیا چمن ابھی
آئندہ گل کھلاتی ہے کیا کیا یہ، دیکھئے
سینچی گئی ہے خون سے زمینِ چمن ابھی
ہے سوز و سازِ محفلِ انجم بس ایک شب
ہوتی ہے صبح، اٹھتی ہے یہ انجمن ابھی

خزاں کے دن گذر گئے، بہار کی ہوا چلی
نکھر گیا شجر شجر، سنور گئی کلی کلی
ستارے جھلملا رہے ہیں، چاند ماند پڑ گیا
اٹھو! اٹھو! ہوئی سحر، گجر بجا، ہوا چلی
لئے ہے جام آفتاب دستِ رعشہ دار میں
یہ کاش! کوئی پوچھتا کہ رات بھر کہاں ڈھلی؟

شمس کی کامیاب منظر کشی کی ایک دو مثالیں اور ملاحظہ فرمائیں:۔
ذرا برسات میں رنگِ زمین و آسماں دیکھو
وہ فرشِ مخملیں پر لوٹتی ہیں بدلیاں دیکھو
لبِ دریا چلو، کیفیتِ آبِ رواں دیکھو
وہ مستانہ روش موجوں کی وہ اٹھکھیلیاں دیکھو
پھر جس وقت دریا جوش میں ہوتا ہے اس کی تصویر دیکھئے:۔
چلی جاتی ہے غصے میں بھری فوجِ گراں دیکھو
وہ موجیں ہے بہ ہے خنجر بکف کف در دہاں دیکھو

برسات میں دریا کا عرض پھیل کر میلوں ہو جاتا ہے اور دور دور تک پانی ہی پانی نظر آتا ہے، اس کی حالت و کیفیت ذیل کی رباعی ظاہر کرتی ہے:۔

چڑھتے ہوئے دریا کی رُوانی دیکھو | تا حد نظر پانی ہی پانی دیکھو
ہر چیز کی ہوتی ہے جوانی اک وقت | برسات میں گنگا کی جوانی دیکھو

منیری کے تغزل میں کلاسیکی حسن و توازن کے پہلو بہ پہلو جدید میلانات بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں کامیاب محبت کا سرور و نشاط ہے تو حالات حاضرہ کے گہرے تاثرات بھی ہیں۔ نیز مقامی رنگ بھی شادابی سے جھلکتا نظر آتا ہے۔ ترقی پسندی کی چمک بھی ہے اور وسیع المشرب مذہبیت و صوفیت کا سوز و جذب بھی۔ غزلوں کے تجربات شاعرانہ کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لینے کے بعد، منیری کی غزلوں کے اسلوب بیان کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ حسن ادا، چستی بندش، لفظوں کا رکھ رکھاؤ، فارسی ترکیبوں کی لطافت، فصاحت و سلاست جمال سامان و اثر آفریں ہیں۔ ہیئت شعری کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ شمس کی غزلوں میں کہیں کہیں اَمثل بے جوڑ اشعار بھی ہیں، لیکن عام ڈھنگ یہ ہے کہ اشعار پر وحدت کیف و حال طاری ہے، اور ان کے اندر تسلسل پایا جاتا ہے منیری نے اپنی شاعری کو نظموں اور رباعیوں کی ہیئتیں بھی عطا کی ہیں، جن کا تذکرہ آئے گا۔ شاعرانہ خصوصیات کم و بیش ہر صنف میں ایک جیسی ہیں ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش | من انداز قدت را می شناسم

منیری کے فن کا انداز قد، ہر جامہ ہر لباس ہر وضع قطع میں پہچانا جاتا ہے اُن کی شاعری کا مزاج عاشقانہ و والہانہ ہے۔ لب و لہجہ میں روانی، صفائی، سادگی

اور موسیقی کی شیرینی، روشنی اور نرم آنچ ہے۔ اُن کے آہنگ میں جوش، زور، شوخی، سرمستی اور وارفتگی پائی جاتی ہے۔

شمسؔ کی شاعری کے سامان آرائش میں صنعتوں کا بھی دخل ہے۔ وہ ان کے ذریعہ اپنی شاعری کو سجاتے اور سنوارتے ہیں۔ اور ایمائیت، اشاریت، تمثیلیت، کنایہ، تشبیہ و تعریض، مجاز، استعارہ کے ذریعہ کلام میں معنویت پیدا کرتے ہیں۔ آیئے ہم معنی آفرینی کی چند مثالیں دیکھتے چلیں :-

بزم عشرت میں بھی کچھ رنگ ہے غمخانے کا
دیدہ پُر آب ہے ساقی ترے پیمانے کا

جس طرف اُٹھ گئی ساقی کی نظر، ہوش نہ تھا
گردش چشم تھی، یا دورتھا پیمانے کا

راہبر کا پتہ نہ منزل کا
اب کدھر جائے قافلہ دل کا

اللہ اللہ! اُمید کے دھوکے
ہے افق پر گمان ساحل کا

حضرت شمسؔ چھوٹی بحروں میں بھی صفائی بیان و پختگی بندش کی خوبی پیدا کرتے ہیں اور معنی آفرینی کے جوہر دکھلاتے ہیں۔ معنویت کے چند اور جلوؤں کا نظارہ کیجئے :-

کچھ تمنائیں نظر آنے لگی ہیں دل کے پاس
کوندتی ہیں بجلیاں آ کر مرے حاصل کے پاس

دل پرشوق میں ہے جلوۂ حسن نگار اب تک
خزاں کی فصل آئی، ہے چمن میں بہار اب تک

وہ کیسا یا الٰہی! کاروان اہل دل ہوگا
تڑپتی ہے مثال نبض جس کی رہگذار اب تک

"دل کے پاس" اور "نگار اب تک" والی غزلوں میں نمایاں طور پر واقعیت کو واردات بنا کر پیش کیا گیا ہے اور تخیل کی مدد سے معنویت پیدا کی گئی ہے، ان میں سوز و گداز، جذب و اثر، اور بیکراں کیفیات پائی جاتی ہیں۔

ہے گردش فلک میں بھی چشم بتاں کا رنگ ✦ یوں در بدر پھرنے والے نہ تھے آسماں سے ہم

بڑی لطیف بات نئے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ یہ جدت شعری ہے۔

ملے کیا چین ہم کو آشیاں میں وحشت دل سے
کہ جو تنکے تھے سب خار مغیلاں ہوتے جاتے ہیں

ایک خوبصورت سی ترکیب دیکھئے:۔

تو اٹھاتا ہی نہیں چہرے سے فانوس حجاب
سوزش پروانہ ہم اے شمع دور رکھتے تو ہیں

جذبی و معنوی کیفیات کا امتزاج ملاحظہ ہو:۔

اے اضطراب دل! تجھے لے جاؤں میں کہاں
منزل پہ بھی پہنچ کے ہے منزل کی آرزو

حسن اس کافر کا ہے گویا بہار بے خزاں ✦ ہے اسی کی ذات کو کچھ اعتبار رنگ و بو
اس خزاں دیدہ چمن میں حسن گل کو کیا قیام ✦ عشق بلبل سے فقط ہے اعتبار رنگ و بو

مصوری اور معنویت کی مثالیں شمس کے کلام میں عام ہیں۔ ان کے یہاں پیکریت اور مثالیت کی صناعی سے معنی کو وسعت دی جاتی ہے:۔

ہے زلف ابر برہم، خیر یا رب میری کشتی کی! ✦ رخ دریا پہ بھی چین جبیں معلوم ہوتی ہے

شمس کے کلام میں اگر ایک طرف مثالیت کی لطافتیں اور رفعتیں ہیں، تو دوسری جانب واقعیت کی آئینہ داری، صفائی و برجستگی۔ معاملات محبت اور منظر کشی دونوں مقامات پر منیری کے فن کے یہ تیور ظاہر ہوتے ہیں۔ منیری کی واقعیت بداماں مسلسل غزلیں حسرت موہانی کی یاد دلادیتی ہیں:

مل مل کے باہم رونا، رو رو کے جدا ہونا
ہنگامۂ محشر کا گویا تھا بپا ہونا

پھر خیالِ زلفِ جاناں سر میں لہرانے لگا
پا بہ جولاں پھر عظیم آباد جانے لگا

وہ ابتدائے ملاقات یاد ہے کہ نہیں
بتاؤ تو، تمہیں وہ رات یاد ہے کہ نہیں

آہ! دھندلی سی یادِ عہدِ شباب
جیسے بھولا ہوا سا کوئی خواب

اُردو غزل گوئی کی روایات نے غمِ جاناں کے بادۂ رنگیں اور غمِ دوراں کی شرابِ تلخ کو بہت ہی رسا اور کیف آور بنا دیا ہے۔ غمِ جاناں کے نشتروں کو مشرقی صوفیت نے رگِ جاں میں تبدیل کر دیا، اور غمِ دوراں کی صعوبتوں کو منزلِ لیلیٰ کی راہ کے خطرات کی صورت میں دیکھا ہے۔ اردو غزل سرائی کے پسِ منظر میں فارسی غزل نگاری کے عظیم روایاتی سلسلے بھی ہیں، جن کی وجہ سے اُردو غزل کی تصویر کی فضائے بعید میں اُمق پیدا ہو گیا ہے۔ مذکورہ بالا نکات کے سہارے اور ایما و اشارہ، تشبیہ و استعارہ، تلمیح و ترکیب سے مدد لے کر شاعر حسن، معنویت، اثر و تاثیر کی تخلیق کرتا ہے۔ غزل کی روایات و تجربات کا کلچر اتنے وسیع، گہرے، لطیف اور مکمل طور پر قائم ہوا ہے کہ تغزل میں بنی

خوبیوں اور معنوی لطافتوں کا اظہار نہایت ہی پُر اثر اور تشفی بخش ہوتا ہے ہر چند کہ یہ اثر بہت ہی نازک، مختصر اور برق آسا ہے۔ ع

وہ جو اک بات ہے بجلی سی چمک جانے میں

تاہم اس کی کشش جمال اور دلنشینی سے تابِ گریز نہیں۔ اُردو میں نظم کی روایات ہنوز اتنی رسا اور پختہ نہیں ہوئی ہیں جتنی غزل کی روایات۔ نظم کا حسن زیادہ صد پہلو، مرکب اور بالیدہ ہوتا ہے۔ اُردو نظم بھی اب جوان ہو رہی ہے۔ لیکن ابھی اس میں عنفوان شباب کا الھڑ پن اور لغزیدہ پائی ہے۔ جب اُردو نظم کھل کے جوان ہو جائے گی اور اپنی عمر کو آئے گی، تو اس کا حسن نکھرے گا، اس کی ادائیں نیرنگ ساماں ہوں گی اور اس کا بھرپور شباب نظارگی کے ہر شوق کو پورا کرے گا۔

شمس منیری کے تغزل میں وہ سب ہے جو ہمیں اُردو غزل کی روایات کے خزانے سے مل سکتا ہے۔ اور حضرت شمس نے اس خزانے میں قیمتی جواہر پارے کے اضافے بھی کئے ہیں۔ بیسویں صدی کے اساتذۂ فن غزل نے جو نئے تجربے کئے ہیں، ان کی وجہ سے اُردو غزل میں تازہ امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ شمس منیری نے بھی اُردو غزل کے افق کو وسیع تر بنایا ہے۔ ان کے یہاں عصر حاضر اور نئے ماحول کی تصویر، تفسیر، تنقید و تعبیر بھی خوب ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کیا محبت کے شرائط پیش ہوں گے، دیکھئے ✽ ہے وفاداری کا ان کی امتحاں منظور آج

اس چمن میں بلبلِ ناشاد کا مت پوچھ حال ✽ سازشِ صیاد و گلچیں ہے وہ خانہ بدوش

بتا اے بادِ صرصر، تو ہی اُن کا حشر کیا ہوگا ہیں باقی آشیانے کچھ میانِ شاخسار اب تک

پیشِ نظر مجموعہ میں حضرت شمس منیری کی چند نظمیں بھی شریک ہیں۔ میں عرض کرچکا ہوں کہ شمس کی شاعری کی خصوصیات اُن کے کلام کی ہر صنف میں پائی جاتی ہیں، لیکن غزلوں میں جو حسن کاری، شادابی، برجستگی اور پختگی ہے، وہ نظموں میں نہیں۔ تاہم بعض نظمیں گرانقدر ہیں، مثلاً 'پروانہ'، 'دل کا کنول' اور 'ہمارا ہندستان'۔ نظم کا حسن اس وقت تک نہیں ظاہر ہوتا، جب تک اسے مکمل نہ دیکھا جائے۔ لہٰذا میں مثالیں نہیں پیش کرتا۔ آپ خود اُن نظموں کو پڑھ کر لطف اندوز ہوں۔ 'ہمارا ہندستان' میں حضرت شمس نے ہیئتی تجربہ بھی کیا ہے۔ اس نظم کی قماش سے بڑی سبک رفتاری ظاہر ہوتی ہے۔ ابتہاج و مسرت، جوش و ولولہ، رقص و مستی کو بہت ہی مناسب ہیئت بخشی گئی ہے۔ لب و لہجہ و آہنگ میں غنائی کیفیت سوز و نیت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ 'پروانہ' میں رنگِ تغزل کی ہبک اور اس کے درد کی کسک ہے۔ 'دل کے کنول' میں زبان کی سادگی، ہلکی تھرکتی ہوئی موسیقی، مقامی رنگ کا چونکا ہوا بھولا پن، اور ارتقائے خیال کا حسن پایا جاتا ہے۔

"پیام و سلام" کے نام سے وہ باب شروع ہوتا ہے، جو دارالسّلام کو لے جاتا ہے۔ میری رائے میں مجموعہ کا یہ حصّہ شمس کی بہترین شاعرانہ و فنکارانہ صلاحیتوں کو روشن کرتا ہے۔ اخلاصِ تجربہ، جذب و رقص، سوز و مستی، پرواز تخیل، امتزاج روح، حسنِ ادا، کمالِ اظہار، توازن و سکونِ فن، موسیقی و جمالِ آہنگ سب کچھ بڑی تکمیل کے ساتھ موجود ہے۔

ملاحظہ ہو:-

فصلِ گل آئی ہے گلشن سے پیام آتا ہے ✤ مژدہ اے اہلِ قفس! تم کو سلام آتا ہے
بلبلو! بادِ بہاری کا پیام آتا ہے ✤ نامۂ لالۂ و گل نام بنام آتا ہے
دیر میں عمر گذاری ہے مگر جانے کیوں ✤ دل تڑپ جاتا ہے جب آپ کا نام آتا ہے

اور اس کے بعد ـــــ

یہ ترا لطف، یہ احسان، یہ عنایت، یہ کرم ✤ تیرا سائل ترا مہمان ہوا جاتا ہے

پھر ـــــ

تمہارے کوچے میں دیوانہ وار آ ہی گیا ✤ دلِ ستم زدہ پھر ایک بار آ ہی گیا
نظر پڑا سگِ لیلیٰ کہیں جو رستے میں ✤ نہ رک سکا دلِ غم دیدہ پیار آ ہی گیا
وہ سامنے نظر آتا ہے خیمۂ لیلیٰ ✤ قرار بخش دلِ بے قرار آ ہی گیا

اور اب دوسری منزل ـــــ

آنکھوں کو مدینے کا جو رستا نظر آیا ✤ اشکوں کا اُمنڈتا ہوا دریا نظر آیا!

اور ـــــ

بتاؤں تمہیں اس عالم کا مرکز؟ ✤ مدینہ، مدینہ، مدینا، مدینہ

پھر وداع کا منظر دل سوز ملاحظہ ہو ـــــ

یوں تری بزم سے ہم سوختہ ساماں نکلے ✤ لالہ ساں داغ بدل شعلہ بداماں نکلے
نہ تو سر پیر کی سدھ بدھ، نہ بجا ہوش و حواس
تیرے دل باختہ با حالِ پریشاں نکلے

آخر میں کچھ حسرتیں اور کچھ یادیں! ـــــ

وہ دلفریبی ارضِ حجاز کیا کہیے   ہے ذرّہ ذرہ وہاں جاں نواز کیا کہیے
جہاں مجاز اک آئینۂ حقیقت ہے   وہاں حقیقت رنگ مجاز کیا کہیے
وہ مسجد نبوی، وہ حریم خاص رسولؐ   نماز اور وہاں کی نماز! کیا کہیے

شمس منیری کی شاعری رہ گذر حسن بھی ہے اور راہ نجات بھی۔ آپ اپنے کاروان ذوق و شوق کو اس رستے پر گامزن کریں۔

اختر اورینوی
شعبہ اُردو۔ پٹنہ کالج
پٹنہ

تقریظ

جرمنی کے مجذوب فلسفی نیٹشے کا قول ہے کہ شریف ترین حسن وہ ہے جو یکایک ہمیں بے قابو نہ کر دے۔ کم و بیش یہی حال شاعری کا بھی ہے۔ یعنی شریف ترین شعر وہ ہے، جو یکایک اپنے سننے والے سے اس کی خودداری نہ چھین لے۔ رذیل ترین اشعار ہمیں یکایک بے قابو کر دیتے ہیں، ہم بے اختیار ہو کر چیخ اُٹھتے ہیں، مگر جوں ہی ان کا اثر زائل ہوتا ہے۔ ہمارا تنقیدی شعور بیدار ہو جاتا ہے اور ان کے نقائص ہم پر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ کسی زمانے میں جب یہ شعر میرے سامنے پڑھا گیا ؎

لبِ جاناں پہ دیکھی کشمکش شرم و تبسم کی ؛ قیامت پر نگاہ آرزو کا گد گدا دینا

تو میں ایک شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ لیکن جوں جوں اس شعر کو دہراتا گیا، میرا نشہ کم ہوتا گیا، یہاں تک کہ بہت جلد اس شعر میں میرے لئے کوئی لذت باقی نہ رہی۔ اس کے بالکل ہی برخلاف چند سال کا عرصہ گذرا جب پروفیسر حافظ شمس الدین احمد شمس منیری کا یہ شعر ایک مجموعہ انتخاب میں میری نظر سے گذرا

؎ منزل بھی ایک، راہ بھی ایک، اختلاف کیوں؟

بس یہ، کہ بڑھ گئے ہیں ذرا کارواں سے ہم!

تو میں نے اس کو دوم درجے کے ایک اچھے شعر سے زیادہ وقعت نہ دی۔ لیکن دوسری مرتبہ جب یہ شعر میرے سامنے سے ٹکرایا تو میرے ذوقِ سخن نے پہلے سے زیادہ لذت محسوس کی، یہاں تک کہ اُسے بار بار پڑھنے لگا،

اور جوں جوں پڑھتا گیا اس کی معنوی کیفیت دل و دماغ کو مغلوب کرتی گئی۔
یہ تھی میری پہلی ملاقات حافظ شمس الدین احمد صاحب کی شاعری سے۔ اس کے بعد پٹنہ کالج آ کر جب اُن سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے ازراہ شفقت گاہے گاہے اپنے اشعار مجھے سُنائے تو مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ بہار نے اپنے اس شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ بہار اس لئے کہ بہار سے باہر انہوں نے اپنے کلام کو پہنچانے کا کبھی خیال ہی نہیں کیا۔ بہار کی پھلواری میں ان کی قسمت بھی ان پھولوں کی قسمت ہے جن کی خوشبو کو ہوا کے جھونکے میسر ہی نہیں آئے۔

مقبول ترین انگریزی نظم "ایلجی" کے مصنف گرے نے انگلستان کے ایک قبرستان میں کھڑے ہو کر گاؤں کے ان مُردوں پر آنسو بہائے ہیں جو بقول اس کے ملٹن کی طرح زبان ناطق رکھتے تھے، مگر حالات نے انہیں بولنے نہ دیا۔ میں انگلستان کے اُن مُردوں سے زیادہ ہندوستان کے ان زندوں کو ہمدردی کا مستحق سمجھتا ہوں جو آنکھیں رکھتے ہیں اور دیکھ نہیں سکتے، جو کان رکھتے ہیں اور سُنتے نہیں، جو سُنتے ہیں اور تڑپتے نہیں، جو دل رکھتے ہیں اور بے چین نہیں ہوتے۔ ہمارا صوبہ خاص طور پر ایسی ہی چلتی پھرتی قبروں کا ایک قبرستان ہے، اور اس قبرستان میں ؎

کیا خبر اس کی کُراں کو جو ہیں سرمست خواب ؛ گلفشانی کس نے کی کس نے شفق چہرہ کا گلاب
کی نسیم صبح نے دم بھر جو دلجوئی تو کیا ؛ رات بھر شبنم سر تربت اگر روئی تو کیا

جس شاعر کا ذوقِ سخن ایک ایسی ناموافق فضا میں بایدہ ہو، اُس میں یہ حوصلہ کہاں سے آئے گا کہ اپنے "لجہائے دل" کو "درون خانہ" سے "برون در" بھیجنے کی جرأت کرے ؎

شرمندہ کیا جوہر بالغ نظری نے ❊ اس جنس کو بازار میں پوچھا نہ کسی نے (وحشت)

ظاہر ہے کہ جس جنس گراں مایہ کی گھر والوں نے پرواہ کی باہر والوں سے اس کی قدر دانی کی کیا اُمید ہو سکتی تھی۔ اس لئے حافظ صاحب سے یہ شکایت فضول ہے کہ انہوں نے اپنے جواہر سخن کو بساط شہرت پر کیوں نہ پھیلایا۔ وہ شاعر تھے اور ایک خود دار شاعر، ان کی خود داری نے شاید اپنے کلام کی اشاعت کو تحسین طلبی سمجھ کر اپنی بیاض کو کشکول گدائی بنانا پسند نہیں کیا۔ یہی نہیں، بلکہ بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں، جنہیں حافظ صاحب خود اپنا کلام سُناتے ہوں۔ اور انہی گنے چنے خوش نصیب لوگوں میں ایک میں بھی ہوں۔ چنانچہ اس دیوان کی طباعت کی ساری ذمہ داری مجھ پر اور اُن چند اہل ذوق حضرات پر ہے جو اُن کے "حریم ذوق" میں عراقی کی طرح "خاصگان مائی" کی حیثیت سے سرفراز ہوں۔ یہی شمس کی سحاب اندر سحاب اور حجاب اندر حجاب ضو پاشیوں کی تقریباتی توجیہ۔ اب رہا ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ، تو اس خدمت کو ایک کامیاب نقاد ہونے کی حیثیت سے اختر اورینوی مجھ سے بہتر انجام دے چکے ہیں۔ اس لئے میرا کام اب یہ رہ گیا کہ ان کے دیوان کے مطالعہ کے سلسلے میں اپنے تقریظی اشاروں سے آپ کے ذوق تلاش کی رہنمائی کروں، ان کے اشعار سُنا سنا کر خود تڑپوں اور آپ کو تڑپاؤں۔ اچھا تو پھر سُنئے، حافظ صاحب کے ذوق تغزل کا پورا پس منظر اور ان کی سوانح حیات کا سارا نچوڑ آپ کو اُن کے اس شعر میں ملے گا۔

وہ شورش دل، وہ جوش جنوں، وہ ٹھوکریں راہ اُلفت میں
وہ اپنی جوانی دیوانی، وہ رات اندھیری کیا کہئے

حافظ صاحب اگرچہ ہر حیثیت سے ایک کامیاب شاعر ہیں۔ انہوں نے
نظمیں بھی لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ قصیدے کی زمین میں بھی تخم ریزی کی
اور کامیاب تخم ریزی کی ہے، رباعیوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور اکثر یہ
طبع آزمائی اہل ذوق کے لئے "خنجر آزمائی" بھی ثابت ہوئی ہے، لیکن ان
کی طبیعت کا اصلی جوہر ان کی غزلیت میں کھلتا ہے! غزلیت بھی ایسی
غزلیت جو "واقعیت" سے لبریز ہو۔ ہماری عاشقانہ شاعری میں
معاملاتی اور واقعاتی تغزل کی باضابطہ ابتدا جرأت نے کی۔ مومن کی
نفسیاتی بصیرت نے اسے انتہا تک پہنچایا۔ مومن کے بعد داغ کی عاشقانہ
ستم ظریفی نے اس میں شوخی کا رنگ اور گہرا کیا۔ داغ کے بعد ان کے
تلامذہ میں شاعر دہلوی اور مبارک عظیم آبادی اپنی خوش ذوقی سے
اس رنگ کی بہار قائم رکھے ہوئے تھے۔ لیکن عہد حاضر کے اخلاق شعور نے
بتدریج اس کو نظر انداز کرنا شروع کیا، اور ہمارے جیسے گرسنگان ذوق
جنہیں اس معاشی بحران میں پیٹ کی باتوں سے دل کی باتیں زیادہ محبوب
تھیں، اپنی بھوکی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جہاں کسی شاعر
سے ملاقات ہوئی، اس سے دل کی باتیں چھیڑنے کی فرمائش کی، جہاں کوئی
دیوان نظر پڑا اس سے اپنے ذوق کی تسکین چاہی۔ اس سلسلے میں اگرچہ
عموماً ناکامیاں ہوتی رہیں۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ حافظ صاحب کا
دیوان کم از کم میری گرسنگی ذوق کے لئے "خوان یغما" ثابت ہوا اور
میں بھوکے ترکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ دوسروں کا ذوق لذت
اس سے آسودہ ہوگا یا نہیں، اس کی ذمہ داری میں نہیں لے سکتا۔ لیکن
مجھے یقین ہے کہ جن کا مذاق سخن میری طرح گرسنہ ہوگا۔ انہیں ان چند اوراق

کے خوان نعمت میں شیرینی، نمکینی اور چاشنی سب کچھ ملے گی، ہاتھ بڑھانا شرط ہے۔ ع

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

اس چھوٹے سے دیوان میں جسے دیوان نہیں، بلکہ دیوانچہ کہنا زیادہ مناسب ہے، آپ کو میرؔ کا سوز، مومنؔ کے راز و نیاز، دردؔ کا تصوف، غالبؔ کی فلسفیت اور آتشؔ کی مستی جا بجا ملے گی۔ یہاں تک کہ ریاضؔ کی رندانہ شوخی اور اکبرؔ کی طنزیہ ظرافت سے بھی آپ ان اوراق کو خالی نہیں پائیں گے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:-

یہ گھٹے ہیں خدا معلوم کن کن آستانوں کے ٭ دکھاتا پھر رہا ہے شیخ محشر میں جبیں اپنی
رونا نہیں آتا کہ رلانا نہیں آتا ٭ واعظ سے اک استاد سے کیا نہیں آتا
پلاؤ قورمہ دنیا میں شہد و شیر جنت میں ٭ خدائی شیخ کے قبضے میں ہے، باقی خدا میرا

ناسخؔ کا لکھنوا پن کتنی ہی بری چیز کیوں نہ ہو، لیکن ہمارے بزرگوں میں شاید کوئی بھی ایسا نہ ہو جو اس رنگ سے کم و بیش متاثر نہ ہوا ہو۔ ہمارے حافظ صاحب چونکہ حالات کے ایک ایسے موڑ پر کھڑے تھے جہاں سے جدید و قدیم رنگ تغزل کے راستے الگ ہو رہے تھے، اس لئے ناسخیت سے پوری طرح بچنا ان کے لئے ممکن نہ تھا، لیکن جہاں کہیں بھی وہ ناسخیت یا لکھنویت سے مغلوب ہوئے، وہاں اپنے شعر میں کوئی نہ کوئی معنوی کیفیت ضرور پیدا کی۔ مثلاً:-

مے فردوس کیا ہے یہ تو تو جانے، مگر واعظ ٭ مے انگور کی وہ خوشہ چیں معلوم ہوتی ہے
منہ پھوڑ کر جواب بھی دیتا نہیں کوئی ٭ اس گل کا حال پوچھتے ہیں ہر کلی سے ہم
حسن کے پیغام ہو گئے وہ سرخ ٭ دیکھئے کیا ہو اب جواب کا رنگ

خارجیت میں داخلیت کا نکھار آپ نے دیکھ لیا، اب ملاحظہ ہو یاسیت سے غالبیت کا سمجھوتہ ؎

جس سے لے بخت سیہ تو نے اُڑایا ہے یہ رنگ
سیکھ اُسی زلف سے کمبخت رسا ہو جانا

حافظ صاحب کے ذوقِ سخن نے آنکھیں اس وقت کھولی تھیں جب کہ ایک طرف بنگال سے وحشت اور پنجاب سے اقبال اہلِ ذوق کو غالب کے تتبع کی دعوت دے رہے تھے۔ ایک ایسی فضا میں جہاں اقبال و وحشت کے نغمے گونج رہے ہوں، کسی صاحبِ ذوق کے لئے غالب کے نہادِ فکر اور اسلوبِ بیان سے قطعاً متاثر نہ ہونا ایک ناممکن سی بات تھی۔ حافظ صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے، اس کا ثبوت آپ کو ان کے کلام میں جا بجا ملے گا۔ ملاحظہ ہو:۔

اک مستیٔ دوام کی اب ہم کو ہی تلاش ٭ اُکتا گئے ہیں روز کی اس مے کشی سے ہم
دھڑکا ہے سرگرانیٔ صبحِ خمار کا ٭ گھبرا گئے ہیں کیفِ شبِ سرخوشی سے ہم
اپنی فطرت کے تقاضے سے ہیں مجبور حسین ٭ ان کا پردہ بھی ہے اک طرح کا عریاں ہونا

اسی سلسلے میں انہوں نے غالب کے ایک شعر کو اپناتے ہوئے اپنی طرف سے جو معنوی تصرف کیا ہے اسے بھی سن لیجئے ؎

درد کا حد سے گذرنا تو ہے آساں اے شمس ٭ سخت مشکل ہے مگر اس کا دوا ہو جانا

تغزل میں تصوف کی چاشنی باضابطہ دردؔ سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن دردؔ نے دہلی کی بزم میں جو دیا جلایا، وہ ناموافق ہواؤں کے جھونکوں سے جلد بجھ گیا۔ آتشؔ نے اس میں ہر چند روغن دیا، لیکن چراغ جل نہ سکا۔ شادؔ نے اس بجھے ہوئے دیئے کو عظیم آباد لا کر پھر سے روشن کیا۔ پتنگے

جب سوز و ساز کی بھیک لینے کے لئے دور دور سے اس کے قریب آئے تو پھر نواح عظیم آباد کا شاعر جو منیر کی مقدس درگاہ کا ہمسایہ بھی ہو، اس فیض سے کیونکر محروم رہ سکتا تھا۔ شمس منیری فقہ پرست سہی لیکن دبستان عظیم آباد میں بیٹھ کر اس روشنی سے کیونکر آنکھ چرا سکتے تھے۔ چنانچہ ایک پورے مذہبی شخص کا (جو اذعان سے زیادہ "قانون" کا ہوا خواہ ہو) صوفیانہ تغزل ملاحظہ ہو:۔

ایک نغمہ سا سنائی دے رہا ہے دل کے پاس
یہ تو ہے آواز کوئی جانی پہچانی ہوئی

جہاں کھویا وہیں پایا گیا ہوں
مرے جو ہر کھلے اس غم کدے میں

ہم کو آتا نہیں پابند مصلیٰ ہونا
فرش خاکی پہ بھی جھک جاتے ہیں سجدے کے لئے

حافظ صاحب کا جذبہ اگرچہ انہیں طریقت کے کوچے میں لے جا کر محبت کی ٹھوکریں کھلواتا ہے۔ لیکن شریعت کا احترام جو ان کی طبیعت میں راسخ ہے، وہ کہیں کہیں ان کی بے خودی سے انہیں آگاہ بھی کرتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

آوارہ اے جبین نیاز اس قدر نہ ہو
دریوزہ گرد تا زبتاں در بدر نہ ہو

لیکن اس تازیانہ احتساب کے باوجود یہ جبین نیاز جب کعبۂ عشق کا رخ کرتی ہے تو عظیم آباد سے لے کر مدینے تک راستے میں سجدوں کا فرش بچھاتی جاتی ہے۔ چنانچہ انہی بکھرے ہوئے سجدوں کی ایک مجموعی شکل ان کا "پیام و سلام" ہے جس کے مطالعہ کے بعد ایک نقاد اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اگر یہ نعت گوئی کو اپنی شاعری کا مستقل موضوع بنائے ہوتے تو گلشن نعت میں شہیدی اور کاکوری سے زیادہ ان کا طوطی بولتا۔

بات میں بات نکلی آرہی ہے اور میں اس تقریظ کو طول دینا نہیں چاہتا۔ لیکن ان کی طبیعت کا جو خاص رنگ ہے، اس کا دوبارہ تذکرہ کئے بغیر یہ تقریظ مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ان

کی طبیعت کا اصلی جوہر ان کے واقعاتی تغزل ہی میں کھلتا ہے۔ اب ان کے واقعاتی تغزل کی بے پناہی ملاحظہ ہو:۔

پھر خیال زلفِ جاناں سر میں لہرانے لگا
پا بجولاں پھر عظیم آباد لے جانے لگا
شمسؔ کو دیکھ کے سکھیوں سے یہ کہنا ان کا
یہ تو کچھ ہم کو نظر آتے ہیں دیوانے سے
تو نے کیا خاک لگی دل کی بجھائی برسات
آکے پردیس میں اور آگ لگائی برسات
شمسؔ اٹھنے کی طرف اپنی سواری پھر چلی
لے کے مجھ کو میرے دل کی بیقراری پھر چلی
پھر چلا میں اُس کی بزمِ ناز میں مستانہ وار
پھر چلی اس باغ میں بادِ بہاری پھر چلی

یہیں تک بس نہیں ہے، بلکہ اپنے ذاتی واردات کو تغزل کے پیرائے میں بیان کرنے کا جذبہ انہیں کبھی کبھی غزل کے مسلمات سے بغاوت کرنے پر بھی آمادہ کردیتا ہے، چنانچہ ایسے موقعوں پر یہ بلا تکلف قدامت پسندوں کی صف سے نکل کر ان انقلاب پسند نوجوانوں کے پہلو میں آکھڑے ہوتے ہیں، جو شعرا کی کورانہ تقلید سے بیزار ہو کر اپنے تغزل کا روئے سخن محبوب سے محبوبہ کی طرف پھیر چکے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ ع

یہ آج کیا ہے کہ دل میں ہیجی کوئی کلیجا مسل رہی ہے،

پوری غزل اسی واردات رنگ میں رچی ہوئی ہے۔ اردو غزل فارسی غزل کی تقلید میں مقامی رنگ سے محروم ہو کر بالکل ایک بدیسی چیز بن گئی تھی، لیکن اپنے دیس کے اس حافظؔ کے یہاں آپ کو شیراز کی بلبلوں کے علاوہ بندرابن کی کوئلیں بھی کوکتی ہوئی نظر آئیں گی، اور اسی مقامی رنگ ہی پر کچھ منحصر نہیں، جب آپ ان کے دیوان کی ورق گردانی کریں گے، تو خود دیکھیں گے کہ حافظ صاحب کہیں زخم لگاتے، کہیں مرہم رکھتے، کہیں نمک چھڑکتے اور کہیں "پرسشِ جراحتِ دل" کے سلسلے میں پورا نمکدان انڈیل

دیتے ہیں۔

آیئے اب رخصت ہونے سے پہلے ان کے تھوڑے سے اشعار اور سنا دیں، جنہیں سننے کے بعد آپ کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ ان کو آفریں کہیں یا مجبور نفریں کریں۔

نہیں آتا یقیں دل کو تمہاری بات پر لیکن ٭ تمہاری بات پھر بھی دلنشیں معلوم ہوتی ہے

یا تم آجاؤ یا یہ دیدو حکم ٭ کہ پپیہے پیا پیا نہ کریں

لڑ گئی تھیں ایک دن ساقی کی آنکھیں شمسؔ کی
پھر قیامت تک نہ اُترا نشہ اس بیخوار کا

کیا بتاؤں مسکرانے کا سبب ٭ تم ہنسو گے اس خیال خام پر

اس آخری شعر پر مومن خاں بے اختیار یاد آتے ہیں، اور یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر حافظ صاحب کے غیر شاعرانہ پیشے کی غیر شاعرانہ مصروفیتیں انہیں فرصت دیتیں اور ابتدائے شباب ہی میں "شعر را بہ مدرسہ کہ برد" کی جگہ "شاعر را بہ مدرسہ کہ برد" کا حادثہ پیش نہ آگیا ہوتا تو آج اُردو شاعری میں مومن کے علاوہ ایک اور کافر کا اضافہ ہو چکا ہوتا۔ اچھا تو اب یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے کہ شاعری کے متعلق جس شاعر کا نظریہ یہ ہو وہ خود کیسا شاعر ہوگا ؎

اسی کو شاعری کہتے ہیں اے شمسؔ ٭ کہ دل کا درد آجائے زباں پر

شمسؔ مینری کے کچھ اور اشعار آپ کو سنا کر میں اپنی یہ مختصر تقریظ ختم کرتا ہوں، ملاحظہ فرمایئے:۔

اس عہد میں تو حسن بتاں بے نقاب ہے ٭ اللہ! اب بھی آپ کو ہم سے حجاب ہے؟

چمن کو دیکھتے ہیں اہل عبرت اس طرح، دیکھو ٭ کھلی ہے آنکھ نرگس کی، زباں ہے بند سوسن کی

چھلکی پردہ داری اور رعب حسن کا پہرا! ٭ یہیں پر امتحاں جرأت رندانہ ہوتا ہے

دل و دیدہ سے پوچھے کوئی افسانہ جوانی کا
کیا اسی دشت میں ہے منزلِ مقصود کہیں؟
آخر وقت نظر بھر کے دیکھ لے ساقی!
تو ایسے درد سے روتا ہے شمس راتوں کو
اے شمس کس کی بزم میں جاگے ہو رات بھر
یہ حشر ہے کہ واقعہ! کہتے ہیں جس کے ذرہ
کر دے بےخودیٔ شوق کہیں گم مجھ کو
پڑے ہیں چند تنکے منتشر صحنِ گلستاں میں
آنسو ہیں ڈبڈبائے ہوئے چشمِ یار میں
چلو اے شمس جنگل کی طرف کچھ دل بہل جائے
جبہ کا ہی کعبہ کی چوکھٹ پہ شمس حسن پرست
وہ فراغت کے بھی دن یاد ہیں جن میں اکثر
ولولے اٹھتے ہیں اے شمس اسی موسم میں
اس نگاہِ غلط انداز کے صدقے ظالم
گنوائیں بھی تم سے جی نالے تو مزا ہو
شیریں لبوں کی ترشیٔ گفتار ہے مزید
کیا جانیں کس کے قامتِ بالا کا تھا خیال
نہیں جھکتا ہے سر کسی در پہ
دیکھئے واں اپنے استقبال کے ساماں ہیں کیا
آستاں پر ترے جھکا تھا کبھی
ناخدا، ناخدا، خدا کے لئے!

ابھی باقی ہیں کچھ عہدِ تمنا دیکھنے والے
جابجا قیس کا نقشِ کفِ پا ملتا ہے
کہ ترے مست کا لبریز جام ہو جائے
کسی کی نیند نہ ظالم حرام ہو جائے
آنکھیں ہیں لال لال تمہاری خمار سے
ہم کو بھی ہے عزیز ترے دل کی آرزو
اس طرح پیار سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو
کسی کی آشیاں بندی کا حاصل دیکھتے جاؤ
موتی بکھرے ہیں دامنِ ابرِ بہار میں
بڑی آبادیاں پنہاں ہیں ویرانوں کی تہ میں
حریمِ ناز ہے کس کی حرم کے پردے ہیں!
کٹ گئی ساری شبِ وصل فقط باتوں میں
ہند میں فصلِ بہار آتی ہے برساتوں میں
جس میں سب کچھ ہے نہاں اور عیاں کچھ بھی نہیں
دکھلائیں نہیں دیدۂ بے خواب کا عالم
واقف نہ تھے کلام کی اس چاشنی سے ہم
کل باغ میں لپٹ گئے سروِ سہی سے ہم
کیا خبر کس کے پائمال ہیں ہم!
کشتیٔ عمرِ رواں پہنچی تو ہے ساحل کے پاس
سر میں اب تک غرور ہے اے دوست
ہے کہیں کچھ نشانِ ساحل کیا؟

الزام اختیار مرے سر پہ دھر دیا — آساں تھی زندگی اسے مشکل بنا دیا

پیاسے آئے، پیاسے بیٹھے، پیاسے اٹھے یاں کے ہم — دیر سے تیری بزم میں ساقی گردش میں پیمانہ تھا

فیضِ الفت سے ابھی بحرِ عدن ہیں آنکھیں — ابھی باقی ہے انہیں کانِ بدخشاں ہونا

میں کہہ رہا تھا کہ آنچل سنبھالئے جلدی — اُڑیں نہ پھر مرے دامن کی دھجیاں دیکھ!

اس پہ پھولوں کی جگہ چاہیئے پتھر برسیں — یہ جنازہ ہے مری جان ترے دیوانے کا

شمس کو ہم بھی سمجھتے تھے بتوں کا بندہ
حشر کے روز یہ کافر تو مسلماں نکلا

جمیل مظہری
پٹنہ کالج۔ پٹنہ

ماہ و پروین

حدیث عشق و مستی ز من بشنو نه از واعظ

که با جام و قدح هر شب قرین ماه و پرونیم

(حافظ)

اللہ، یہ صنم کدہ کیسا بنا دیا!
اِس خاکداں کو حُسن کی دُنیا بنا دیا!
صد جلوہ ہائے بوقلموں سے جہان کو
آشوب گاہ طورِ تجلّی بنا دیا!
اِک سادہ رُو کو تمکنتِ ناز دے دیا
اِک سادہ دل کو محوِ تمنّا بنا دیا

اِک نونہالِ عشق کو مجنوں دیا خطاب

اِک نوبہارِ حُسن کو لیلیٰ بنادیا

سِکھلائی آدمی کو محبّت کی کیمیا

دِل دے کے مُشتِ خاک کو سونا بنادیا

اِنساں کو عقل دے کے کیا گرمِ جُستجو

عالم کو اِک عجیب مُعمّا بنادیا

اِک جنگ نیک و بد حق و باطل میں چھیڑ دی

دُنیا کو مذہبوں کا اکھاڑا بنادیا

لوگوں کو حرص و آز و ہوا کا کیا غلام

قوموں کو اِقتدار کا بھوکا بنادیا

بخشا ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ شمسؔ

ہنگامۂ جہاں کو تماشا بنادیا

---

(۲)

اِک ہوا نے کیا سے کیا رنگ گلستاں کر دیا!
ہر کلی کو گُل کیا، ہر گُل کو خنداں کر دیا
باغ میں بادِ بہاری نے لگا دی آگ سی
ہر شجر، ہر نخل کو آتش بداماں کر دیا
کوئی دیکھے سبزہ زاروں میں گھٹاؤں کی بہار!
شاہدِ فطرت نے زُلفوں کو پریشاں کر دیا
لختِ دل آنکھوں میں آئے، کیوں نہ ہو لے فیضِ عشق
خارِ مژگاں کو بھی تو نے گُل بداماں کر دیا
تھی دلِ پُر داغِ عاشق میں گلستاں کی بہار
تُم نے وُہ گُل دستہ وقفِ طاقِ نسیاں کر دیا

وہ دل ویراں میں آئے تھے اسی میں رہ پڑے
خانۂ خالی تھا، ہم نے نذرِ مہماں کر دیا

دشت وحشت میں وہ اب پہلی سی رونق ہی نہیں
موت نے مجنوں کی، ویرانے کو ویراں کر دیا

کیا سبکدوشی ہوئی شمسؔ میری عشق میں
جان دی اللہ کو، دل نذرِ جاناں کر دیا

۳

کشتۂ ناز کا انداز انوکھا ہوگا
خون کے رنگ سے ملبوس شہانا ہوگا

شعلۂ عشق دبانے سے دبے گا کیا خاک
آبِ شمشیر کے چھینٹوں سے یہ ٹھنڈا ہوگا

بات اُس لب سے جو نکلے گی مزے کی ہوگی
تلخ گفتار سہی، ذائقہ میٹھا ہوگا

اِن بتوں سے یہ توقع کہ پسیجیں، توبہ!
اِن کے پہلو میں تو پتھر کا کلیجا ہوگا

سرنوشتِ ازلی مٹ نہیں سکتی ظالم
کوئی کیوں در پہ ترے ناصیہ فرسا ہوگا

ظُلم کے ڈر سے نہ باز آئے گا سچّا عاشق
آپ کر دیکھئے، اس کا نشہ اُلٹا ہوگا

ایک دیوانہ سا ہے شمسؔ منیری کیا ہے
روز آتا ہے ادھر آپ نے دیکھا ہوگا

---

(۴)

نقاب اُٹھتے ہی کیا اے طالبِ دیدار گرنا تھا
تماشا دیکھنا تھا، کر کے آنکھیں چار گرنا تھا

دلِ بے تاب تھا مثلِ سپند آمادۂ سوزش
مرے خرمن پہ برقِ آتشیں رخسار گرنا تھا

مٹانی تھی طلب ہم پیاس سے مرجانے والوں کی
کبھی تو خاک پر اے ساغرِ سرشار گرنا تھا

گرا بھی میں تو یوں آرام ہی یاروں کو پہنچایا
مری قسمت میں مثلِ سایۂ دیوار گرنا تھا

بہت اُڑنے لگا تھا میں بھی، لیکن شکر ہی یارب!
مرے ہاتھوں سے جامِ بادۂ پندار گرنا تھا

یہی الھڑپن آئندہ رہے گا تو ہنسی ہوگی
اُلجھ کر یوں نہ دامن سے مرے سرکار گرنا تھا

ازل ہی سے مری ہمت نہ تھی رسوائے ناکامی
مجھے اے شمس اڑنے کے لیے تیار کرنا تھا

۵

خزاں سے پامال ہو رہا ہے چمن جو تھا اپنی آرزو کا
جو گل بظاہر شگفتہ ہیں بھی نہیں ہے نام اُن میں رنگ و بو کا

کسی کو ہڈی پہ اپنی غرہ، کسی کو یاں زعم ہے لہو کا
عجیب قصہ ہے این و آں کا عجیب جھگڑا ہے ما و تو کا

نہ ہم میں اوصاف صدق و خلت نہ ہم میں غیرت نہ ہم میں ملت
گیا ہے ناموس دین و ملت، خدا ہی حافظ ہے آبرو کا

بھلا کرو گے بھلا ملے گا، بُرا کرو گے بُرا ملے گا
اُسی نے کاٹا ہے جس نے بویا، اُسی نے چاٹا ہے جس نے تھوکا

کہاں وہ دنیا ہے تیری یارب جہاں ہیں خوش وقت مرد و زن سب
نہ کوئی زردار کوئی مُفلس، نہ کوئی ننگا نہ کوئی بھوکا

کٹھن تھا رستہ کڑی تھی منزل، مگر جو ہادی تھے حضرتِ دل
نہ کوئی اٹکا نہ کوئی بھٹکا، نہ کوئی بھولا نہ کوئی چوکا

تری زباں ہے زبانِ دہلی، ترا بیاں ہے بیانِ فطرت
کبھی نہ بھولیں گے اہلِ رانچی مزا تری شمسؔ گفتگو کا

(۶)

چمن میں جاؤ تو ابرِ بہار ہو جانا
ہماری یاد میں کچھ اشک بار ہو جانا

یہ خوب ہی مرے سارے گلوں کا ایک جواب

نظر جھکا کے ترا شرمسار ہو جانا

یہ قدرتی ہے کشش، دل کو دل سے راحت ہے

عجیب ہے آپ کا کیوں بے قرار ہو جانا

تمہیں بتاؤ کہ اچھا ہے یا بُرا، کیا ہے

نگاہِ خلق میں بے اعتبار ہو جانا

وفا کرو، کہ یہ ہمت کا کام ہے اے دوست

وگرنہ سہل ہے غفلت شعار ہو جانا

رہے گی یاد یہ ان کی ادا قیامت تک

مرے مزار پہ روز ایک بار ہو جانا

ہوئے وہ خانہ نشیں آہ کچھ نہ کام آیا

مرا غبارِ سرِ رہ گذار ہو جانا

ہے سن ہی کیا ابھی رشکِ چمن ابھی سے ہو
شباب آتے ہی رشکِ بہار ہو جانا

خدا بچائے، بڑے عیب کی ہے بات یہ بھی
کسی کا دست نگر، زلّہ خوار ہو جانا

(۷)

خود نمائی میں بڑے ہو کے سوا ہو جانا
بُت ہو طفلی میں، جوانی میں خدا ہو جانا

جس طرح عاشق ارباب ستم ہیں ہم لوگ
یوں ہی تم دشمن ارباب وفا ہو جانا

جس سے اے بخت سیہ تو نے اُڑایا ہے یہ رنگ
سیکھ اُسی زلف سے کمبخت رسا ہو جانا

دامِ گیسو سے نکلنا تو ہے آساں لیکن
دامِ اُلفت سے ہے دشوار رہا ہو جانا

جب شب و روز کو چاہو کہ اکٹھے ہو جائیں
سر کھلے بام پہ تم جلوہ نما ہو جانا

اے پُتو! قد کی درازی میں بھی ہے حسن ضرور
مگر اچھا نہیں انگشت نما ہو جانا

نہ تغافل کا گلا پھر، نہ جفا کا شکوہ
کچھ عجب چیز ہے پابندِ وفا ہو جانا

کیا کریں ہمّت عالی کو نہیں ہے منظور
ورنہ آسان تھا راضی بہ رضا ہو جانا

"درد کا حد سے گذرنا" تو ہے آساں اے شمسؔ
سخت مشکل ہے مگر اس کا "دوا" ہو جانا

(۸)

اِبتدا ہی سے ہے گردش میں زمانا دل کا
قصۂ آدم و حوّا ہے فسانا دِل کا

آپ کمسن ہیں نہ سمجھیں گے فسانا دل کا
ٹھیریئے، ٹھیریئے، آتا ہے زمانا دل کا

وہ بڑی دھوم سے اک شخص پہ آنا دل کا
ہائے وہ عہدِ جوانی، وہ زمانا دل کا

یہ وہ شیشہ ہے کہ جُڑتا نہیں جب ٹوٹ گیا
توڑنا سہل ہے مشکل ہے ملانا دل کا

کچھ وہی جانتے ہیں جن کو لگا ہے یہ روگ
دل لگی لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا

جو حیا سے نہیں ہوتی ہیں برابر نظریں
انہیں نظروں سے تو مشکل ہے بچانا دل کا
دیکھیے جس کو وہ ہے حسن سراپائے شمس
پوچھیے جس سے وہ کہتا ہے فسانا دل کا

(۹)

اس تجمل سے مرا لاشۂ بے جاں نکلا
ساتھ اک قافلۂ حسن گل افشاں نکلا
قید وحشت سے رہائی نہ ملی تا دمِ مرگ
دشت سمجھا جسے مجنوں نے وہ زنداں نکلا
خود نمائی ہے حسینوں میں حیا سے بڑھ کر
شب کے پردے میں بھی عریاں مہِ تاباں نکلا

لوٹ لایا چمن خلد کی دُنیا میں بہار
باغ جنّت سے میں کب بے سروساماں نکلا

کر کے گھائل مجھے وہ شوخ نظر کیوں رہی
زخم سے تیر ترا چھوڑ کے پیکاں نکلا

آہ تھی اِک نفس سرد وہ آندھی ٹھیری
اشک تھا قطرۂ ناچیز وہ طوفاں نکلا

اشک گل رنگ ہوا عشق کی تاثیر یہ ہے
کان الماس سے بھی لعل بدخشاں نکلا

دیکھ کر رحمتِ حق حشر کے میدان سے میں
اپنے ناکردہ گناہوں پہ پشیماں نکلا

شمس کو ہم بھی سمجھتے تھے بتوں کا بندہ
حشر کے روز یہ کافر تو مسلماں نکلا!

(۱۰)

کچھ نہ پوچھو بانکپن تیغ نگاہ یار کا
جس طرف کو اُٹھ گئی خوں ہو گیا دو چار کا

اب بھی آجاؤ، ہے کب سے منتظر دیدار کا
آج ہے کل چل بسے کیا ٹھیک ہے بیمار کا

ڈالیاں خمیازہ کش ہیں پھول ہیں ساغر بکف
واعظو! اس میکدے میں کام کیا ہُشیار کا!

صفحۂ صحرا پہ گل بوٹوں کا مطلب کچھ تو ہے
یہ نمونہ ہے الٰہی کس خطِ گلزار کا؟

ایک جامِ چشم میگوں اس طرف بھی ساقیا
ہوں بہت مدت سے پیاسا شربتِ دیدار کا

راہِ اُلفت ہی کٹھن دیتا ہی اس میں کون ساتھ
عرصۂ غم میں پتا ملتا نہیں غمخوار کا
لڑ گئی تھیں ایک دن ساقی سی آنکھیں شمس کی
پھر قیامت تک اُترا نشہ اس میخوار کا

۱۱

بزمِ عشرت میں بھی کچھ رنگ ہے غمخانے کا
دیدہ پُر آب ہے ساقی ترے پیمانے کا
جس طرف اُٹھ گئی ساقی کی نظر ہوش نہ تھا
گردشِ چشم تھی، یا دور تھا پیمانے کا
بے اثر رہ نہیں سکتی دلِ مضطر کی تپش
وہ بھی تڑپیں گے جنہیں شوق ہی تڑپانے کا

یہ بھی آنا ہے کوئی، آئے خفا ہونے کو
پیار سے آؤ تو بے شک ہے مزا آنے کا
آئے غصّہ میں، چلے رُوٹھ کے، دونوں بے لطف
یُوں نہ آنے کا مزا ہے، نہ مزا جانے کا
آپ فرماتے ہیں محفل سے چلے جانے کو
سَر چلا جائے، مگر میں تو نہیں جانے کا
اِس پہ پھُولوں کی جگہ چاہیئے پتھر برسیں
یہ جَنازہ ہے مری جاں ترے دیوانے کا
تو مرے سینۂ ویراں کو حقارت سے نہ دیکھ
دل ہے پوشیدہ خزینہ اسی ویرانے کا
کعبہ بے وجہ سیہ پوش نہیں ہے اے شمسؔ
ہے یہ ماتم کسی اُجڑے ہوئے بُتخانے کا

(۱۲)

توصیف سے وہ حسن عیاں ہو نہیں سکتا
جو سب پہ عیاں ہے وہ بیاں ہو نہیں سکتا

یہ حال ہے اب ضبط فغاں ہو نہیں سکتا
افسوس! نہاں رازِ نہاں ہو نہیں سکتا

کیا ابرِ بہاری کو مری آنکھ سے نسبت؟
گریاں سہی، خونابہ فشاں ہو نہیں سکتا

اے شیخ! بسنت آئی، یہ ہے موسم رندی
اس فصل میں ماہِ رمضاں ہو نہیں سکتا

جنّت کا تصوّر بھی مزیدار ہے واعظ
لیکن عوضِ عمرِ رواں، ہو نہیں سکتا

اے موت! نظر آئے نہ پھر جس میں کوئی خواب
ایسا کوئی کیا خواب گراں، ہو نہیں سکتا؟

گو گنج گراں مایہ ہے یہ رازِ محبت
لیکن دلِ ویراں میں نہاں ہو نہیں سکتا

نرگس! تری کچھ قدر نہیں اہلِ نظر میں
دیدہ ترا چشمِ نگراں ہو نہیں سکتا

ہے شمس منیری کے بھی نالوں میں عجب سوز
جب[1] تک کہ نہ ہو آگ، دھواں ہو نہیں سکتا

(۱۳)

وہ ہو گئے مری آہوں سے بدگماں دیکھا؟
سمجھ گئے کہ لگی آگ جب دھواں دیکھا

[1] ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو (مشہور)

وہی حیا ہے، وہی سادگی، وہی شوخی
وہی ادائیں حسینوں میں ہیں جہاں دیکھا
بتوں کی شکل میں، پھولوں کے رنگ میں اے حسن!
وہیں یہ لوٹ گئے ہم تجھے جہاں دیکھا
پڑی جو رات کو بھٹی کے ناہداں پہ نظر
جناب شیخ کو میں کیا کہوں کہاں دیکھا
پٹک دیا تری چوکھٹ سمجھ کے سر ہم نے
درِ حرم پہ جو فرسودہ آستاں دیکھا
میں کہہ رہا تھا کہ آنچل سنبھالے جلدی
اُڑیں نہ پھر مرے دامن کی دھجیاں، دیکھا؟
گماں ہوا کہ ہے تاروں کے بیچ میں اک چاند
انہیں کبھی جو حسینوں کے درمیاں دیکھا

زمانہ پھر گیا ایک آنکھ کے اشارے میں
بتوں کی آنکھ میں بھی رنگ آسماں دیکھا
نہ پوچھ شمس کا حال اے غزالِ خانہ نشیں
کہ تیرے بشیر کو صحرا میں نیم جاں دیکھا

(۱۴)

دیکھ اس فصل میں غنچوں کا خود آرا ہونا
چاہیئے دیدۂ نرگس تجھے بینا ہونا
ہوگئی آئینہ دل کی کدورت ظاہر
تیرے تیور کا غضب ہو گیا میلا ہونا
جان پر کھیل کے دکھلائیں جانباز ہیں ہم
شرط ہے آپ کو کچھ ذوق تماشا ہونا

ابرِ صد چاک کے پردے میں ہو جیسے مہتاب

جا بجا سے وہ قبا کا تری مسکا ہونا

عاشقی کام ہے ہمّت کا اگر سچ پوچھو

چاہیئے دل کے بھی دینے کو کلیجا ہونا

جان نکلی تنِ مضطر سے لپٹ جانے کو

آہ! آغوشِ محبت کا تری وا ہونا

شوخ دیدوں پہ نہ مغرور ہو اتنا نرگس

اور ہی چیز ہے کچھ دیدۂ بینا ہونا

ہے یہ منظور تڑپتا رہے زخمی برسوں

سخت کاری ہے ترے وار کا اوچھا ہونا

فرشِ خاکی پہ بھی جھک جاتے ہیں سجدے کیلئے

ہم کو آتا نہیں پابند مصلیٰ ہونا

آنسوؤں میں ہی جو اے شمسؔ میری سُرخی
اور بھی چاہیئے اس رنگ کو گہرا ہونا

(۱۵)

خدا رکھے عجب انداز مستانہ ہے آنکھوں کا
شراب حُسن سے لبریز پیمانہ ہے آنکھوں کا
جسے دیکھو کسی کی مست آنکھوں کا ہے متوالا
یہ دنیا کیا ہے ساقی ایک میخانہ ہی آنکھوں کا
تری چشمِ عنایت اس طرف گر ہو تو دل کیا ہی
کہ جانِ ناتواں بھی ایک نذرانہ ہی آنکھوں کا
کتاب عشق و الفت کو پڑھا ہم نے تو یہ سمجھا
کچھ افسانہ دلوں کا ہے کچھ افسانہ ہی آنکھوں کا

الگ ہر عضو بجائے خدا کا شکر کرتے ہیں
بُتوں کو دیکھ لیتے ہیں، یہ شکرانہ ہی آنکھوں کا

نگاہیں تیر، پلکیں برچھیاں، ابرو کمانیں ہیں
معاذ اللہ! کیا انداز ترکانہ ہے آنکھوں کا!

وہ مجھ کو دیکھ کر شرما کے نظریں پھیر لیتے ہیں
کسی سے سُن لیا ہی شمس دیوانہ ہی آنکھوں کا

(۱۶)

دیر سے ہم ہیں ہتھیلی پہ لئے سر اپنا
آیئے، آپ بھی، دکھلایئے جوہر اپنا

اب نہ وہ جوش، نہ وہ شور، نہ وہ شر اپنا
کچھ عجب حال ہوا ہے متغیر اپنا

ہم کو اب گورِ غریباں کی فضا بھاتی ہے
ہم بھی بنوائیں گے چھوٹا سا وہیں گھر اپنا

موت کے بعد بھی نبھ جائے وہی وضع یہی
خشت ہے تکیۂ سر، خاک ہے بستر اپنا

ٹوٹ جائے نہ کہیں بیچ میں مینائے فلک
ہم زمانے سے لڑاتے ہیں مقدر اپنا

رازِ دل کس سے کہیں کون ہے اپنا اے شمسؔ!
غیر پھر غیر ہے جانیں اسے کیونکر اپنا

(۱۷)

کہتے کہتے حال چپکا ہو گیا — شمسؔ! سچ بتلا تجھے کیا ہو گیا؟
رات دن رونے کا چسکا ہو گیا — یا الٰہی! دل کو یہ کیا ہو گیا؟

یہ نہ سمجھو زخم اچھا ہو گیا — دل میں اک ناسور پیدا ہو گیا

گھٹتے گھٹتے عمر آدھی رہ گئی — بڑھتے بڑھتے درد دونا ہو گیا

ابتدا ہی سے تھے آثارِ جنوں — رفتہ رفتہ مجھ کو سودا ہو گیا

لٹنے والی تھی جو دولت لٹ گئی — تھا نصیبوں میں جو ہونا ہو گیا

اب نہ وہ دل ہے نہ دل کی شورشیں — ختم وہ قصہ ہی سارا ہو گیا

اب نہ وہ ساقی، نہ وہ بزمِ نشاط — اٹھ کے رخالی جام و مینا ہو گیا

قیس کے دم سے تھی رونق کچھ نہ کچھ — آج ویرانہ بھی سونا ہو گیا

شمسؔ کے حالِ زبوں کو دیکھ کر
دوستوں میں حشر برپا ہو گیا

——(۱۸)——

راہبر کا پتا، نہ منزل کا! — اب کدھر جائے قافلہ دل کا؟

اللہ اللہ! اُمید کے دھوکے — ہے افق پر گمان ساحل کا

اک نگاہِ عتاب ہے ان کی — رنگ بدلا ہوا ہے محفل کا

ناخدا! ناخدا! خدا کے لئے — ہے کہیں کچھ نشان ساحل کا؟

کیا بہار آئی باغ میں صیاد؟ — شور کیسا ہے یہ عنادل کا؟

جھک گئے اس کو کعبہ جان کے ہم — تھا جو کالا غلاف محمل کا

کیوں لئے ہے یہ خنجر سرمہ؟ — کیا ارادہ ہے چشم قاتل کا؟

سجدے ہوتے رہیں گے بعد کو شمس — پہلے کر لے طواف محمل کا

شمس باشندۂ منیر شریف — یہ پتا ہے تمہارے بسمل کا

(۱۹)

ٹوٹے ہوئے سبو کو مرے دل بنا دیا

ساقی نے اک نگاہ میں کامل بنا دیا

لاؤں کہاں سے اب میں وہ رعنائی خیال؟

ہر آرزو کو جس نے مری دل بنا دیا

یہ انبساط عمر دو روزہ اسی سے ہے

جان آفریں نے دل کو جو غافل بنا دیا

الزام اختیار مرے سر پہ دھر دیا

آساں تھی زندگی اُسے مشکل بنا دیا

یوں بھی یہ تیری آنکھ تو خونریز کم نہ تھی

سُرمہ لگا کے اور اُسے قاتل بنا دیا

کشتی کو اہل عزم نے طوفاں میں ڈال کے

موجوں کے درمیاں میں ساحل بنا دیا

سونی سی لگ رہی تھی یہ بزم آپ کے بغیر

محفل کو میری آپ نے محفل بنا دیا

حساس و دردمند نہ تھا اس قدر یہ دل
کن حادثوں نے دل کو مرے دل بنا دیا؟
اے شمس تو تو آگ تھا، اک وقت وہ بھی تھا
کس چیز نے تجھے متحمّل بنا دیا؟

(۲۰)

آپ کی ضد یا مری وحشت سے یہ جھگڑا ہوا
خیر، جانے دیجئے، جو کچھ ہوا اچھا ہوا
اے بتو دل کی نہ پوچھو، تھا کبھی باغ و بہار
اب وہی اک پھول ہے تن میں مرجھایا ہوا
جب رضائے دوست کے تابع ہوئی اپنی رضا
پھر تو یہ حالت ہوئی، یاں ہم نے جو چاہا ہوا

آکے قاصد کا یہ کہنا "دے دیا خط آپ کا"

اور مرا گھبرا کے اس سے پوچھنا "پھر کیا ہوا؟"

کس طرح باغِ تمنا میں بہار آئے گی پھر؟

ہر کلی، ہر غنچہ اس کا سوکھ کر کانٹا ہوا

آہ! کل کی شام تک جو تھی بساط آرائے ناز

صبح کو دیکھا تو ان کا ٹاٹ تھا اُلٹا ہوا

خواب میں بھی اب نہیں صورت دکھاتے ہو کبھی

چاہنے والوں سے اپنے اس قدر پردا ہوا!

جانے کیوں ہر بار ملتا ہے مزا اس میں نیا

قصۂ دل ہے ہزاروں بار دہرایا ہوا

اللہ اللہ! شمس کی غم سے یہ حالت ہو گئی

آستینیں تر، پھٹا دامن، گلا مسکا ہوا

(۲۱)

اثرِ عیش ہے دنیا میں پریشاں ہونا
خندۂ گل نہیں جُز چاک گریباں ہونا

فیضِ اُلفت سے ابھی بحرِ عدن ہیں آنکھیں
ابھی باقی ہے انہیں کانِ بدخشاں ہونا

کاش چلتیں تنِ بسمل سے لہو کی دھاریں!
کاش آتا مری ہر رگ کو رگِ جاں ہونا!

اپنی فطرت کے تقاضے سے ہیں مجبور حسیں
ان کا پردا بھی ہے اک طرح کا عریاں ہونا

عہد میں اس بتِ غارتگرِ دیں کے اے شیخ
کوئی آسان نہیں صاحبِ ایماں ہونا

کچھ تعجب نہیں وحشت کی غلط پوشی میں
چاک دامن کا مرے چاک گریباں ہوتا

وقت طفلی ہے ابھی عہد شباب آنے دو
ابھی باقی ہے مرے گل کو گلستاں ہونا

کاش کاشانۂ غم کی مرے قسمت چمکے!
کاش آجائے انہیں شمع شبستاں ہونا!

کیا مری قدر ہوئی بزم بتاں میں مت پوچھ؟
شمسؔ کافی تھا فقط میرا مسلماں ہونا

(۲۲)

پھر خیال زلف جاناں سر میں لہرانے لگا
پا بہ جولاں پھر عظیم آباد لے جانے لگا

پھر ہوئی وحشت جنوں کو وادیٔ دکھلا سے

کس کی بزمِ ناز کا ہنگامہ یاد آنے لگا؟

پھر سمٹ کر زیرِ چادر آ گئے پلے جنوں

شوق کس کی آرزو میں ہاتھ پھیلانے لگا؟

کیوں جلا ہوں دل سوے کیوں جگر تھامے ہوئے؟

کس کی نظروں کی خلش کا لطف تڑپانے لگا؟

پھر دبی چنگاریاں ظالم کریدیں کس لیئے؟

بادِ کش بن بن کے ہر خط آگ بھڑکانے لگا

پھر غلط ٹھہرا ہمارا دعویٰ وارستگی

گیسوؤں کی بیڑیوں میں پھر مزا آنے لگا

کیوں نگاہ مہرباں سے تم نے شہ دیدی اُسے؟

لو دلِ مضطر مچل کر آفتیں ڈھانے لگا

کس طرح لگتا تھا دشت نجد میں مجنوں کا جی؟

تیرا دیوانہ تو بندرابن میں گھبرانے لگا

پھر بڑھا شمس منیری کی طبیعت میں جنوں

مدّتوں پر پھر تغزّل میں مزا آنے لگا

(۲۳)

آئے گا اس میں خیال یار بھی ڈرتا ہوا

دل مرا اک جھوپڑا، ٹوٹا ہوا، اُجڑا ہوا!

تم سے کیا چھوٹا کہ بزم دہر ویراں ہوگئی

پھر نہ جی بہلا کسی سے اس طرح تنہا ہوا

دیکھ لی تیری ادا جس میں، تڑپ کر رہ گئیں

بارہا ترسی ہوئی آنکھوں کو یہ دھوکا ہوا

باغ دل کا ہے لگدکوب حوادث سے یہ حال

ہر کلی ٹوٹی ہوئی، ہر پھول ہے مسلا ہوا

کیا خفا ہو کر نقاب خاک میں تم چھپ گئیں؟

کیا ہمیشہ کے لئے بندے سے اب پردا ہوا؟

اتفاقاً ایک دن پہنچا جو گورستان میں

کیا بتاؤں چوٹ کھائے دل کا عالم کیا ہوا!

اُس طرف بھائی، اِدھر والدؒ اُدھر خالو، چچا

ٹوٹی قبروں پر سکوت موت تھا چھایا ہوا

دیکھ کر اِک قبر تازہ، دل ہوا بے اختیار

پھر نہیں معلوم مجھ کو بعد اس کے کیا ہوا

یہ سنا اے شمس گھر پر ہوش میں آنے کے بعد

تھا میں تعویذ مزار یار سے لپٹا ہوا

دل جو ٹوٹا تو پھر افسوس! ملایا نہ گیا
ہم سے جایا نہ گیا، اُن سے بلایا نہ گیا
زخمِ پنہاں کسی ظالم کو سُنایا نہ گیا
دل کی رُوداد کو افسانہ بنایا نہ گیا
بدگمانی مرے صیّاد کی جاتی ہی نہیں
قیدئ دامِ محبّت کہیں آیا نہ گیا
باغ سے بُلبُلِ بیکس کو اُجاڑا تو مگر
پھر وہ گلشن کسی صورت سے بسایا نہ گیا
گرچہ تھے خوگرِ بیداد بھی، ہم اہلِ نیاز
ناز جب حد سے بڑھا ہم سے اُٹھایا نہ گیا

ظالمو! دہر میں قانونِ مکافات بھی ہے
کون ہے جس نے ستایا، جو ستایا نہ گیا؟

یار نے غیر کا پس خوردہ بڑھایا جب جام
غیرتِ عشق سے وہ مُنہ سے لگایا نہ گیا

گردشِ چرخ رہی چشمک لیلیٰ کی رفیق
وادیٔ نجد میں بھی قیس بسایا نہ گیا

اُس کے گُم ہونے پہ احباب نے ڈھونڈھا تو بہت
شمسؔ دلسوختہ صحرا میں بھی پایا نہ گیا

(۲۵)

دل جانے کا غم ہی کیا تھا یار سے جب یارا نہ تھا
دل تو دیا تھا جان کے ہم نے جان کا وہ بیچارا نہ تھا

جلوۂ حسن سے بیخود ہو کر سر کو جھکا یا سجدے میں
آنکھ اٹھا کر دیکھ نہ پائے کعبہ یا بتخانہ تھا

سب سامان عیش تھے حاصل انکی جوانی سے ہم کو
چہرے میں گلزار کھلا، آنکھوں میں مے خانہ تھا

سب سے بڑھ کر ہشیاروں کو ہم نے غافل پایا یاں
جو جتنا فرزانہ تھا وہ اتنا ہی دیوانہ تھا

پیاسے آئے، پیاسے بیٹھے، پیاسے اٹھے یاں سے ہم
دیر سے تیری بزم میں ساقی گردش میں پیمانہ تھا

صیّاد اور گلچیں دونوں ہی کی آنکھیں کچھ پرنم سی تھیں
گلشن میں بلبل کی زباں پر یہ کس کا افسانہ تھا؟

شعر و سخن کے بادہ کشوں کی مستی اب تک باقی ہے
سنتے ہیں شیراز نگر میں حافظ کا میخانہ تھا

صحن چمن کی ساری رونق بلبل ہی کے دم سے تھی
بلبل نے جب باغ کو چھوڑا باغ نہیں ویرانہ تھا
خوب ہی گذری اُن دونوں کی جب دونوں مل بیٹھے
شمس منیری دیوانہ اور بیدل بھی دیوانہ تھا

—(۲۶)—

آہ دُھندلی سی یادِ عہدِ شباب ! | جیسے بھولا ہوا سا کوئی خواب
زندگی کیا ہی خوش گذرتی تھی | رات کو مست اور دن کو خراب
ہر نگاہ لطیف، حسن عمل ! | ہر گناہ عظیم، کارِ ثواب
اُن کا چہرہ تھا، یا گلستاں تھا | تھی چمیلی کہیں کہیں تھا گلاب
تھا عجب سوز و سازِ بزمِ وصال | ہر نظر شمع، ہر نفس مے ناب
ہمدل و ہم زبان و ہم پیشہ | کیا ہوا اُف ! وہ مجمعِ احباب ؟
جس سے دل میں سرور تھا اے شمس | اب وہ صحبت ہوئی خیالِ خواب

(۲۷)

آنکھ میں تجھ سے نور ہے اے دوست

دل میں تجھ سے سرور ہے اے دوست

سبزہ و گل میں یہ کشش کیوں ہے

ان میں کس کا ظہور ہے اے دوست ؟

تیری آمد سے میرا غم خانہ

آج دار السرور ہے اے دوست

ایک دن تجھ سے لڑ گئی تھی آنکھ

دل میں اب تک سرور ہے اے دوست

ہے نگاہِ کرم کا تیری فیض

دل کا شیشہ جو چور ہے اے دوست

تجھ پری وش سے اس کو کیا نسبت

میں نے مانا کہ حور ہے اے دوست

وہ بھی ہے تیری چشم مست کا فیض

گر شراب طہور ہے اے دوست

آستاں پر ترے جھکا تھا کبھی

سر میں اب تک غرور ہے اے دوست

اک تجلّی کے واسطے پھر شمسؔ

مضطرب مثل طور ہے اے دوست

(۲۸)

جیٹھ جب ختم ہوا تب کہیں آئی برسات

اس جہنم میں ہوا خلد کی لائی برسات

مر رہی تھی تری مخلوق تپش سے یارب!
شکر ہے شکر! کہ پھر تو نے دکھائی برسات

ڈال دی خشک درختوں میں نئی جان تو نے
اللہ اللہ! تری اعجاز نمائی برسات

راگ چشموں کا کہیں، مینہ کی چھما چھم ہے کہیں
خوب آتی ہے تجھے نغمہ سرائی برسات

زیب تن سبز قبا خندہ بلب، زلف بدوش
آئی پھر، اور عجب شان سے آئی برسات

ولولے جوش جوانی کے پھر اُٹھے اے شمس
ہم نے جانا کہ بہار آئی جب آئی برسات

(۲۹)

تو نے کیا خاک لگی دل کی بجھائی برسات!
آکے پردیس میں اور آگ لگائی برسات
بجلیاں آہ کی، نالوں کی کڑک، اشک کا مینہ
کیسے سامان سے میرے لئے آئی برسات!
چمن و دشت دُھلے، دل کی کدورت نہ مِٹی
نہ ہوئی تجھ سے بھی سینے کی صفائی برسات
لطف ہی موسم باراں کے نہیں جب حاصل
ہم کو کیا اس سے غرض، آئی نہ آئی برسات
یار گریاں ہے گھٹا چھائی ہے، ہم پا بہ سفر
شمس کیا ہم نے بھی امسال گنوائی برسات!

(۳۰)

کل جو جابر تھے نظر آتے ہیں وہ مجبور آج

صاحبِ مقدور جو تھے، ہیں وہ بے مقدور آج

اب نہ آزادی، نہ اطمینان، نہ وہ امن و امان

کل تھے منزل سے بہت نزدیک ہم، ہیں دور آج

اب بسیرا اس میں ہے رنج و غم و اندوہ کا

لیجئے! ویرانۂ دل ہو گیا معمور آج

ہر طرف ہے دین و ملت پر ہی نرغہ، کیوں نہ ہو!

اپنی لادینی سیاست ہے بہت مشہور آج

کیا محبت کے شرائط پیش ہوں گے، دیکھئے!!

ہے وفاداری کا ان کو امتحاں منظور آج

بلبلیں سیکھیں صدائے زاغ چھوڑیں اپنی لے

یہ گلستاں میں ہوا جاری نیا دستور آج

گنج پرویزی لگے گا ہاتھ کل بھی یا نہیں؟

جانِ شیریں کے لئے ہے کوہ کن مزدور آج

بزمِ فردا کی اُمیدیں گرچہ خوش آیند ہیں

شیشہائے دل غریبوں کے ہیں چکنا چُور آج

اِس میں کیسی ٹیس ہے شمسِ منیری کچھ نہ پوچھ؟

پھٹ گیا ہے زخمِ دل کا یک بیک انگور آج

(۳۱)

اذانوں، نمازوں میں نام محمدؐ — اِسی سے ہے ظاہر مقامِ محمدؐ

وَمَا یَنطِقُ صاف ناطق ہی اس پہ — کلامِ الٰہی کلامِ محمدؐ

ہے تکمیل انسانیت اس میں مضمر — سنو غور سے تم پیامِ محمدؐ

وہی امنِ عالم کا ضامن رہے گا — جو قائم ہوا تھا نظامِ محمدؐ

ہے اس دعوتِ حق کی دنیا مخاطب — ہے سب کے لئے فیضِ عامِ محمدؐ

شرابًا طہورا سے کیا انکو مطلب — جو ہیں مست کاس الکرامِ محمدؐ

کبھی جو کی روٹی، کبھی فقر و فاقہ — کٹیں اس طرح صبح و شامِ محمدؐ

کوئی جا کے اربابِ سطوت سے کہدے — کہ خاصانِ حق ہیں غلامِ محمدؐ

تجھے خوف اے شمسؔ کیا دشمنوں سے
کہ ہے حرزِ جاں تجھ کو نامِ محمدؐ

(۳۲)

نہ سنبھلا عاشقِ جانباز تیرا مبتلا ہو کر
لگا کمبخت کو تیرِ نظر، تیرِ قضا ہو کر

نصیحت کر رہے ہو ہمدمو ترک محبت کی؟

تم ایسی بات کہتے ہو مرے درد آشنا ہو کر!

انہیں کو وعدہ کر کر کے مکرتے میں نے دیکھا ہے

انہیں ہونٹوں نے مارا چشمۂ آب بقا ہو کر

نظر میں کُھب گئے اس کے پڑی جس کی نظر تم پر

کوئی کس طرح بھولے تم کو صورت آشنا ہو کر

تمہیں بتلاؤ پھر اس دل کو کس کے پاس لے جاؤں؟

تمہیں خود توڑتے ہو اس کو اس کا آسرا ہو کر!

گنہگاروں کو رحمت ڈھونڈتی پھرتی ہے محشر میں

جناب شیخ نے کیا منھ کی کھائی پارسا ہو کر!

نہ کر اے شمس الفت روگ ہے یہ زندگی بھر کا

کہیں اچھا ہوا بھی ہے یہ درد لا دوا ہو کر!

(۳۳)

رواں ہیں لوگ اگلوں کے نشاں پر
چلے جاتے ہیں نقشِ کارواں پر
وہی ہے گھر ہمارا اس جہاں میں
بسیرا کر لیا ہم نے جہاں پر
شفق ہے، یا لگی ہے چرخ میں آگ؟
گھٹا ہے، یا دھواں ہے آسماں پر!
چھڑی ہے عالمِ بالا میں بھی جنگ
ستارے ٹوٹتے ہیں آسماں پر
زمیں گو ہوگئی ہے ہم پہ اب تنگ
دماغ اپنا ہے لیکن آسماں پر

وہاں توپیں ہوئی جاتی ہیں بے کار
ہمیں یاں ناز ہے تیر و کماں پر

لگی ہے خانۂ صیّاد میں آگ
گری بجلی یہ کس کے آشیاں پر؟

بتوں کی یورشیں کعبے پہ دیکھو!
ہے اک نرغہ حرم کے پاسباں پر

اسی کو شاعری کہتے ہیں اے شمسؔ
کہ دل کا درد آجائے زباں پر

——— ۳۴ ———

کب نظر کرتے ہیں ہم انجام پر
مرد مرمٹتے ہیں ننگ و نام پر

اک نگاہ لطف قیمت دل کی ہے
لے بھی لو، مہنگا نہیں اس دام پر

کیا بتاؤں مسکرانے کا سبب؟
تم ہنسو گے اِس خیال خام پر

ہجر جاناں میں ہماری زندگی
منحصر ہے نامہ و پیغام پر

طور پر دیکھا تھا موسیٰ نے جسے
ہم نے دیکھا ہے اسی کو بام پر

عرصۂ اُلفت ہے ناپید اکنار
مُشکلیں سو سو ہیں اک اک گام پر

آہ! شمسؔ رند یہ داغ شراب!
اور وہ بھی جامۂ احرام پر!

(۳۵)

کچھ تمنائیں نظر آنے لگی ہیں دل کے پاس
کوندتی ہیں بجلیاں آکر مرے حاصل کے پاس

رہروانِ راہ الفت کے لئے منزل کہاں
ہیں وہی گم کردہ رہ بھٹکے ہیں جو منزل کے پاس

دیکھئے اُن کی نظر کا تیر چلتا ہے کسے
چند ٹکڑے ہیں جگر کے بھی دلِ بسمل کے پاس

یہ تو ہے آواز کوئی جانی پہچانی ہوئی
ایک نغمہ آشنائی دے رہا ہے دل کے پاس

منحصر تیر نظر یا تیغ ابرو پہ نہیں
اور بھی خونریز تر حربے ہیں کچھ قاتل کے پاس

دیکھئے' واں اپنے استقبال کے ساماں ہیں کیا؟

کشتیٔ عمر رواں پہنچی تو ہے ساحل کے پاس

ساربان! یہ خاکِ مجنوں تو نہیں ہے رقص میں؟

اک بگولا سا نظر آتا ہے کیا محمل کے پاس؟

ہیں کسی طوفاں زدہ کے باقیات الصالحات

شمسؔ یہ تختے نظر آتے جو ہیں ساحل کے پاس

——— (۳۶) ———

دل سے نکلی اک فغانِ دلخراش

ہوگیا رازِ نہاں افسوس! فاش

سنتے سنتے طعنہ ہائے دل خراش

ہوگیا ہے دل ہمارا پاش پاش

آپ جو فرمائیے وہ سب دُرست

ہم ہی بدخو ہیں، ہمیں ہیں بدمعاش
اُن سے قربت کا ہو کیسے حوصلہ
سُن رہا ہوں میں صدائے دورباش
ضبط کی، برداشت کی حد بھی کوئی؟
دل ہی ہے آخر، نہیں کچھ تیغ کی قاش
بندگی میں کس طرح بہلے گا جی!
کوئی بھی اپنا نہیں ہے خواجہ تاش
نیکیاں ضائع، بدی کو ہے فروغ
کچھ عجب ہے دورِ حاضر کی قماش
اس زمانے میں سکونِ قلب کی
ہے طلب لغو، اور بے حاصل تلاش

ختم ہو گا شمس یہ قصہ جبھی
کوچۂ قاتل سے جب نکلے گی لاش

۲۷

دلِ پُر شوق میں ہے جلوۂ حسنِ نگار اب تک
خزاں کی فصل آئی اس چمن میں ہے بہار اب تک
نہ اب وہ ساقیِ مہوش، نہ اب وہ بادۂ رنگیں
مگر اس بزمِ دوشیں کا ہے آنکھوں میں خمار اب تک
نقابیں اُٹھ چکی ہیں گلرخوں کی ایک مدت سے
چمن میں دیدۂ نرگس ہے محوِ انتظار اب تک
ذرا پردہ اُٹھا، پیچھے کو مُڑ کر دیکھ اے لیلیٰ!
تعاقب میں ترے محمل کے ہے کس کا غبار اب تک؟

نہ سیرِ گلشن و صحرا، نہ بزمِ ساغر و مینا!

جنابِ شیخ ہیں بیگانۂ رسمِ بہار اب تک

جنابِ شیخ کی ریش حنائی ہو چکی رُسوا

لگا ہے مُنہ پہ تقوی کا یہ رنگیں اشتہار اب تک!

وہ کیسا یا الٰہی کاروانِ اہلِ دل ہوگا؟

تڑپتی ہے مثالِ نبض جس کی رہ گزار اب تک

بہت سے انقلاب آئے وہی حالت رہی اپنی

وہی گردش ستاروں کی' وہی لیل و نہار اب تک

بتا اے بادِ صرصر تو ہی' اُن کا حشر کیا ہوگا

ہیں باقی آشیانے کچھ میانِ شاخسار اب تک

وہ در پے ہیں نشانِ قبر بھی باقی نہ چھوڑیں گے

ہماری خاک سے بھی ان کے دل میں ہے غبار اب تک

ہمارے خون کے چھینٹوں سے ہے رنگیں گلستاں میں

زمین صحن گلشن دیکھیے، ہے لالہ زار اب تک

اسی کا ظرف ہے آنکھیں ملائے ہی جو ساقی سے

ہے اتنا پی کے بھی شمسؔ منیری ہوشیار اب تک

کلیلیں آہوؤں کی دیکھنے جاتا ہے صحرا کو

جوانی جا چکی، ہے شمسؔ کو شوق شکار اب تک

۳۸

ظاہر اکچھ بھی ہو نقاب کا رنگ

یار چھپتا نہیں شباب کا رنگ

شعلۂ برق جیسے بادل میں

آہ اُس چشمِ پُر عتاب کا رنگ!

لاکھ پی کر کوئی جوان بنے
اور ہی ہے مئے شباب کا رنگ

زہد و تقویٰ کو کر رہا ہے سلام
یار کی چشم بے حجاب کا رنگ

اُن کے چہرے میں رنگ دو ہی ہیں
یا چنبیلی کا یا گلاب کا رنگ

آنسوؤں میں کہاں سے آتا ہے
اے تنِ زرد، خونِ ناب کا رنگ؟

شیخ نے پی ہے آج، تیز ہے کچھ
اس کی باتوں میں احتساب کا رنگ

آئیں پیرانِ پارسا، دیکھیں
شمسؔ، اس آفت شباب کا رنگ

۳۹

دل سکوں طلب کو پھر نہیں قرار آج کل
کسی کی یاد آرہی ہے بار بار آج کل

بہار کیا دکھا رہے ہیں برگ و بار آج کل
ریاض خلد کی زمیں پہ ہے بہار آج کل

چمن کے پھول پھول پہ ہے کیا نکھار آج کل!
زمیں گلستاں بنی ہے لالہ زار آج کل

ہوائے باغ ہے گلوں کو سازگار آج کل
ہیں ایک ایک پھول پر فدا ہزار آج کل

کسی کو یاں نہیں ہو رنج روزگار آج کل
ہے عیش چند روزہ کا بھی اعتبار آج کل

نہیں ہے دل پہ شیخ کو بھی اختیار آج کل
ہے سب کے سر پہ عاشقی کا جن سوار آج کل

نہ صرف باغ و راغ میں عیاں ہے جوش نامیہ
طبیعتوں میں زندگی کا ہے ابھار آج کل

گلوں کے رنگ روپ میں ہے دلکشی بڑھی ہوئی
ہیں بلبلیں بھی کچھ زیادہ بے قرار آج کل

فغان عندلیب کی طرف لگے ہیں گوش گل
ہے گرم حسن و عشق کا بھی کاروبار آج کل

ہواؤں میں ہیں مستیاں فضاؤں میں ہیں مستیاں
غلط ہے میکشوں کو شکوۂ خمار آج کل

صلائے عام دے رہا ہے شمس پیر میکدہ
پیو پیو نہیں ہے خوف گیرودار آج کل

(۴۰)

قائلِ کیف و جذبِ حال ہیں ہم
منکرِ بحث و قیل و قال ہیں ہم

نہیں جھکتا ہے سر کسی در پر
کیا خبر کس کے پائمال ہیں ہم!

کیا کسی سے اُٹھے گا بار اپنا
اپنے ہی دوش پر وبال ہیں ہم

یہ طلب کس کی ہے؟ کس کی تلاش؟
کیوں سراپا بے سوال ہیں ہم؟

ایک بھولا ہوا فسانہ ہیں
ایک گذرا ہوا خیال ہیں ہم

غور کیجئے تو اک گمان ضعیف
ایک ہلکا سا احتمال ہیں ہم

ہیں وہ اپنے کمال میں بے نقص
نقص میں اپنے باکمال ہیں ہم

دیکھنے میں ہیں گرچہ زار و نحیف
بدر ہوں گے ابھی ہلال ہیں ہم

کون ہے شمس دوسرا ہم سا؟
آپ اپنی یہاں مثال ہیں ہم

(۴۱)

بھاگے تو تھے کشاکشِ بزمِ بتاں سے ہم
"پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم"
اللہ! اُن کی یاد اب اتنی سی رہ گئی؟
گویا کبھی ملے تھے کسی مہماں سے ہم

اس بزمِ کائنات کی رونق وہی رہی
اور آگئے یہاں جو اُٹھے درمیاں سے ہم
تیری وفا نے گھر کو بھی جنّت بنادیا
نکلے تھے عیش چھوڑ کے باغِ جناں سے ہم

منزل پہ پہلے کون پہنچتا ہے، دیکھئے
دوڑے ہیں شرط باندھ کے عمرِ رواں سے ہم

ہے گردش فلک میں بھی چشمِ بتاں کا رنگ
یوں ورنہ دبنے والے نہ تھے آسماں سے ہم

ہم چھوڑ دیں وطن کو یہ خوابِ خیال ہے
چھوٹے گا ہم سے ہند نہ ہندوستان سے ہم

منزل بھی ایک، راہ بھی ایک، اختلاف کیوں؟
بس یہ کہ بڑھ گئے ہیں ذرا کارواں سے ہم[1]

راہِ طلب میں جس کے نشاں ہر قدم پہ ہیں
ملنے چلے ہیں شمسؔ اسی بے نشاں سے ہم

۴۲

اے شمسؔ دل لگائے ہوئے ہیں اسی سے ہم
ملتے ہیں ان بتوں سے فقط دل لگی سے ہم

[1] فیضی از قافلۂ کعبہ روان نیست بدِل ☆ ایں قدر ہست کہ از ما قدمے در پیش است

دھڑکا ہے سرگرانیٔ صبحِ خمار کا
گھبرا رہے ہیں کیفِ شبِ سرخوشی سے ہم

اک مستیٔ مدام کی اب ہم کو ہے تلاش
اُکتا گئے ہیں روز کی اس مے کشی سے ہم

مُنہ چھوڑ کر جواب بھی دیتا نہیں کوئی
اُس گُل کا حال پوچھتے ہیں ہر کلی سے ہم

یہ سلسلہ ہے ترکِ تعلق کے بعد بھی
خوش ہیں کسی سے وہ تو خفا ہیں کسی سے ہم

شیریں لبوں کی تُرشیٔ گفتار ہے لذیذ
واقف نہ تھے کلام کی اس چاشنی سے ہم

کیا جانے کس کے قامتِ بالا کا تھا خیال؟
کل باغ میں لپٹ گئے سروِ سہی سے ہم!

جیسے یہاں ہمیں کوئی پہچانتا نہیں
کیوں آج ان کی بزم میں ہیں اجنبی سے ہم؟

اے شمس ادعائے محبت بجا، درست
لیکن یہ کیا؟ اُلجھتے ہیں ہر مدعی سے ہم

(۴۳)

گالوں میں ترے ہے گل شاداب کا عالم
بالوں میں ترے سبزۂ سیراب کا عالم
وہ گیسوئے مشکیں ترے افشاں کے وہ ذرّے
ہر ذرّہ پہ وہ کرمک شب تاب کا عالم
برگ گل خوش رنگ پہ وہ قطرۂ شبنم
وہ گوش حسیں میں در خوش آب کا عالم!

جان آگئی ہے لعل کے ٹکڑوں میں کہاں سے

اللہ! تمہارے لب شاداب کا عالم

رونے میں بھی تصویر تری پھرتی ہے ان میں

آنکھوں میں ہے اب چشمۂ پایاب کا عالم

گنوائیں کبھی تم سے بھی تارے تو مزا ہو

دکھلائیں تمہیں دیدۂ بے خواب کا عالم

ہم جانتے ہیں رقت قلب آپ کی اے تمس

دیکھا ہے بہت دیدۂ پر آب کا عالم

(۴۴)

اے ہند! یہ سبزہ، یہ نباتات کا عالم

ہے رشک بہاراں تری برسات کا عالم

یہ برق، یہ بادل، یہ دھواں دھار گھٹائیں
یہ سحر، یہ جادو، یہ طلسمات کا عالم

یہ آبِ رواں اور نظر افروز یہ سبزی
یہ مینہ کی جھڑی اور یہ قطرات کا عالم

وہ رات اندھیری، وہ سرِ شام سے بارش
وہ پہلی پہل اُن سے ملاقات کا عالم

وہ تمکنتِ حسن، وہ خودداریِ عصمت
وہ کشمکشِ شوق، وہ جذبات کا عالم

ہر لفظ میں وہ شکوۂ بیجا کی تراوش
ہر بات میں وہ حُسنِ مراعات کا عالم

غمزوں میں وہ اک نازشِ پنہاں کی لگاوٹ
چھیڑوں میں وہ اک لُطف مدارات کا عالم

ہر لمحہ جن اوقات کا تھا لمحۂ رنگیں

بھولے کوئی کس طرح ان اوقات کا عالم

وہ رات کہ تھی حاصل ایام جوانی

اے شمسؔ کہوں کس سے میں اس رات کا عالم

(۴۵)

مجھے لالہ و گل سے غرض نہیں کچھ ترے سنبل و سرو سمن کی قسم

ترے عارض رشک چمن کی قسم تری زلف شکن بہ شکن کی قسم

ہے کدھر مرے ساقی بزم ولا؟ غم دہر نے مجھ کو خراب کیا

کوئی گردش چشم ادھر بھی ذرا، تجھے گردش چرخ کہن کی قسم

ترا جور و جفا ترا غیظ و غضب نہیں مجھ کو باعث رنج و تعب

تجھے مجھ سے ہے حلف وفا کی طلب تو یہ بات دار و رسن کی قسم

مجھے تیری خوشی سے ہے عین خوشی مرا مقصد دل ہی سکوں طلبی
مرے صفحۂ جاں پہ شکن ہے پڑی تری صاف جبیں کی شکن کی قسم

مجھے دہر میں چین نصیب کہاں مری آنکھیں ہیں اور یہ سیل رواں
تجھے آئے نہ آئے یقیں مری جاں ہے دو آبۂ گنگ و جمن کی قسم

ہے بزرگوں کے دفن کی جا یہ زمیں اسے چھوڑ کے جاؤنگا میں نہ کہیں
مری خاک بھی جم کے رہے گی یہیں مجھے جذبۂ خاک وطن کی قسم

مجھے خانۂ عیش ہے دار محن مجھے روضۂ خلد ہے بیت حزن
ترے ہجر میں اے مرے وعدہ شکن ترے وعدہ صبر شکن کی قسم

ترے شعروں میں شمسؔ عجب ہے مزا ترے نغمہ سے دل کو سکوں سا ملا
ہمیں پھر کوئی تازہ غزل تو سنا تجھے تیرے ہی لطف سخن کی قسم

(۴۶)

مستی آنکھوں میں تری، رنگ حنا ہاتوں میں

رس ہے ہونٹوں میں بھرا اور مزا باتوں میں

موسلادھار ہے مینہ اور اندھیری گھُپ رات

تم نہیں ہو تو مزا کچھ نہیں ان راتوں میں

وہ فراغت کے کبھی دن یاد ہیں جن میں اکثر

کٹ گئی ساری شبِ وصل فقط باتوں میں

سچ کہو آئے ہو کیا خون کسی کا کر کے

کیا لگایا ہے بتاؤ تو سہی ہاتوں میں؟

ولولے اُٹھتے ہیں اے شمس اسی موسم میں

ہند میں فصلِ بہار آتی ہے برساتوں میں

۴۷

معلوم ہے تجھ کو اے ہمدم کیوں داغ جگر ہیں لالوں میں؟
یہ رشک ہے اس کا مہندی ہے اس گلرو کے پامالوں میں

وہ رند جو ہیں ساقی تیری مست آنکھیں دیکھنے والوں میں
ہر وقت شراب اُن کے آگے رکھی ہی بھری دو پیالوں میں

جو پیچ ہیں تیری زلفوں میں جو رنگ ہیں ترے گالوں میں
وہ پیچ نہیں ہیں کالوں میں وہ رنگ نہیں ہیں لالوں میں

دیدوں میں غضب کی شوخی ہے نظروں میں بلا کی مستی ہے
یہ ہوش نہیں ہشیاروں میں یہ کیف نہیں متوالوں میں

بے مہر ہیں سب یہ مت کہئے ہیں اچھی سیرت والے بھی
ان اچھی صورت والوں میں ان موہنی صورت والوں میں

میں صبح گیا گلشن کی طرف کچھ دل کی تپش کو کم کرنے
واں آگ لگی تھی پیڑوں میں سیماب بھرا تھا تھالوں میں
یہ شمس منیری کی ہے صدا اگلی سی کہاں شورش اس میں
وہ سوز نہیں ہی آہوں میں وہ درد نہیں ہے نالوں میں

(۴۸)

میں جنّت سے نکلوایا گیا ہوں	خدا جانے کہاں لایا گیا ہوں
نہیں یوں امتحاں گاہ جہاں میں	فرشتوں تک سے جچوایا گیا ہوں
زرِ خالص بنا ہوں غم میں تپ کر	کسوٹی پر میں کسوایا گیا ہوں
متاعِ دل کو چھنوایا بتوں سے	سرِ بازار لٹوایا گیا ہوں
مئے و شاہد کو کیا جنت سے نسبت	بڑا حرصی ہوں للچایا گیا ہوں
دکھا کر دور سے کچھ جھلکیاں سی	وہ فرقت میں دوڑایا گیا ہوں

ہے مجبوری میں مختاری کی تکلیف　　عجب پھانسی پہ لٹکایا گیا ہوں!

مِرے جوہر کھلے اس غمکدے میں　　جہاں کھویا وہیں پایا گیا ہوں

وہی ہے آب و تاب بے تکلّفی شمسؔ

ازل ہی سے میں چمکایا گیا ہوں

(۴۹)

یہ ستم یارِ آشنا نہ کریں!　　برملا ان کا تذکرا نہ کریں

آہ و فریاد و نالہ و شیون　　کارگر ہو سکے تو کیا نہ کریں

اِنتہا پھر نہ ہونے پائے گی　　آپ شکووں کی ابتدا نہ کریں

قہر کا خوف، عفو کی اُمید　　کیا کریں اے غفور کیا نہ کریں؟

ان بتوں نے بہت ستایا ہے　　کہیئے اب بھی خدا خدا نہ کریں؟

یا تم آجاؤ، یا یہ دے دو حکم　　کہ پپیہے پیا پیا نہ کریں

شمسؔ اس مہ کی آرزو کیا خوب!
بس بس! آپ اس کا حوصلا نہ کریں

۵۰

سرِ تسلیم مرا دیکھ لو! خم ہے کہ نہیں؟
اب خوشی تم کو مرے سر کی قسم ہے کہ نہیں؟
میری سوزش کا بھی کچھ حال تمہیں ہے معلوم؟
دل میں میرے لئے کچھ دردو الم ہے کہ نہیں؟
وقتِ رخصت یہی اقرار یہی وعدہ تھا؟
کیوں، تمہیں یاد بھی وہ قول و قسم ہے کہ نہیں؟
ہو خفا مجھ سے تو لکھنا تھا سبب ہی اس کا
آخر اس گھر میں دوات اور قلم ہے کہ نہیں؟

اور تھی میری خطا بھی، تو کیا کیوں نہ معاف؟

مجھ پہ اب نظرِ لطف و کرم ہے کہ نہیں ؟

میں ہوں پردیس میں، تم دیس میں بیٹھی ہو مگر

کچھ مری فکر تمہیں، کچھ میرا غم ہے کہ نہیں ؟

انتظار آج بھی خط کا تھا، نہ آیا افسوس !

ظلم پر ظلم، ستم پر یہ ستم ہے کہ نہیں ؟

پیار سے مجھ کو نہ رکھو تو چلا جانے دو

جانے والوں کے لئے ملکِ عدم ہے کہ نہیں ؟

شمسؔ نے اپنی مصیبت کا یہ سوچا ہے علاج

تو شدار و نہیں ملتی ہے تو سم ہے کہ نہیں !

(۵۱)

ان کی صورت کو دیکھتا ہوں میں
اپنی قسمت کو دیکھتا ہوں میں

مُسکراتے ہیں مُنھ کو پھیر کے وہ
اس عنایت کو دیکھتا ہوں میں

آنکھ ملتے ہی مُسکرا دینا
اس مروّت کو دیکھتا ہوں میں

یہ شبِ قدر ہے کہ وصل کی رات؟
کس کی صورت کو دیکھتا ہوں میں!

اک چھلاوہ ہے آج پیشِ نظر
ایک آفت کو دیکھتا ہوں میں

یہ نہ سمجھے کوئی بُت خود بیں
صرف صورت کو دیکھتا ہوں میں

ظاہری حال سے نہیں مطلب
دل کی حالت کو دیکھتا ہوں میں

حُسنِ صورت مجھے نہیں منظور
حُسنِ سیرت کو دیکھتا ہوں میں

شمسؔ اس مہ کی آرسی میں آج
اپنی صورت کو دیکھتا ہوں میں

۵۲

خوشی بھی ملتی ہے مجھ کو تو غم کے پردے میں
وہ لطف کرتے ہیں لیکن ستم کے پردے میں

دل اس طرف کو جو بے اختیار کھنچتا ہے
ہے کوئی پردہ نشیں کیا حرم کے پردے میں؟

میں کعبہ جان کے گر جھک گیا تو تھا معذور
حرم کی شان تھی بیت الصنم کے پردے میں

کھلا یہ ہم پہ حسینوں کی بے نیازی سے
صمد کی ذات ہے پنہاں صنم کے پردے میں

یہی ہے پردہ تمہارا جو اپنے عاشق سے
تو وہ بھی جا کے چھپے گا عدم کے پردے میں

جب آئے مجھ سے وہ ملنے نقاب پوش آئے

عجب یہ ظلم ہے لُطف و کرم کے پردے میں!

جُھکا ہے کعبہ کی چوکھٹ پہ شمسِ حُسن پرست

حریمِ ناز ہے کس کی حرم کے پردے میں؟

(۵۳)

عقیدہ کچھ بھی ہو لیکن خدا کا نام لیتے ہیں

یہی وہ نام ہے سب جس کو صبح و شام لیتے ہیں

دِکھانے کو فقط اکثر خدا کا نام لیتے ہیں

خدا کے نام سے بھی لوگ کیا کیا کام لیتے ہیں!

پیالہ ہاتھ میں جب رند مے آشام لیتے ہیں

تو پھر جو چاہتے ہیں آسماں سے کام لیتے ہیں

پلانا ہو ہمیں منظور تو آنکھیں ملا ساقی

انہی دو ساقیوں کے ہاتھ سے ہم جام لیتے ہیں

یہ ہیں اربابِ دل، رندوں پہ منھ آتا ہے کیا واعظ!

خدا کا نام بھی دل سے یہی بد نام لیتے ہیں

یہاں پینے سے مطلب تلخ و شیریں کی نہیں پروا

ترا ساغر بھی ہم اے گردشِ ایام لیتے ہیں

کسی کی بزم میں اے شمسؔ اب یہ قدر ہے اپنی

کہ ہم جب اُٹھنے لگتے ہیں تو دامن تھام لیتے ہیں

۵۴

مست ہیں کیفِ جوانی سے تمہاری آنکھیں

اللہ اللہ یہ نشیلی، یہ خماری آنکھیں!

یوں تو ہیں سب کی نگاہوں میں یہ پیاری آنکھیں

کوئی دیکھے مِری آنکھوں سے تمہاری آنکھیں

جمع کیوں قتل کے ساماں یہ کیئے ہیں تم نے؟

برچھیاں پلکیں، بھویں تیغ، کٹاری آنکھیں

جب ہنسے تم تو کھلے لب چمنستاں ہو کر

اور روئے تو بنیں ابرِ بہاری آنکھیں

مُفت میں ختم شبِ وصل ہوئی جاتی ہے

کھول دو کھول دو اب میری پیاری آنکھیں

جامِ گلگوں کا اثر ہے کہ مئے عشق کا فیض؟

شمسؔ کیوں رہتی ہیں گلرنگ تمہاری آنکھیں

شمسؔ واللہ بہت خوب کہا نجمیؔ[1] نے

"کوئی دیکھے مِری آنکھوں سے تمہاری آنکھیں"

[1] نجمی شاعرِ اُڑیسہ

۵۵

سرِ رہ حُسن کے جلوے فراواں ہوتے جاتے ہیں

جو تھے بازارِ اعراب یوسفستاں ہوتے جاتے ہیں

دکانِ حسن کے ساماں ارزاں ہوتے جاتے ہیں

متاعِ ہوش کے لُٹنے کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

سرِ محفل وہ ہنس ہنس کر گل افشاں ہوئے جاتے ہیں

شریکِ بزمِ رنگیں گل بداماں ہوتے جاتے ہیں

وہ کیا رنگِ چمن دیکھیں، خود ان کے رنگ کیا کم ہیں!

جوانی کی بہاروں میں گلستاں ہوتے جاتے ہیں

یہ عالم ہے چمن میں آج کل جوشِ بہاراں کا

گلوں سے خار بھی دست و گریباں ہوتے جاتے ہیں

ملے کیا چین ہم کو آشیاں میں وحشتِ دل سے!
کہ جو تنکے تھے سب خارِ مغیلاں ہوتے جاتے ہیں

ہمیں معلوم ہے کیا حشر ہوگا ان کے وعدوں کا
کہ وعدے کرتے جاتے ہیں پشیماں ہوتے جاتے ہیں

الٰہی وصل میں ہو خیر ناموسِ محبت کی
کہ اب جامے سے باہر دل کے ارماں ہوتے جاتے ہیں

چمن میں نونہالانِ چمن کا جوبنا دیکھو!
یہ گُل بوٹے بھی اب سروِ خراماں ہوتے جاتے ہیں

اُمیدیں تھیں، وفا کی داد اِک دن مل ہی جائیگی
وہ خوابِ خوش مگر خوابِ پریشاں ہوتے جاتے ہیں

جُھکا دیتے ہیں سر محرابِ ابرو دیکھ کر اکثر
جنابِ شمسؔ اب پکے مسلماں ہوتے جاتے ہیں

۵۶

ہم اُن کو پیار کرتے ہیں وہ ہم کو پیار کرتے ہیں
خدا کا شکر ہے اس طرح اپنے دن گزرتے ہیں

نہ پوچھو کچھ یہ دنیائے دنی کیسی بُری شے ہے؟
فرشتے بھی بہت ڈرتے ہوئے یاں پاؤں دھرتے ہیں

سمجھ کر قصد کرنا زاہدو بحرِ محبّت کا
کہ پار اس بحر سے تلوار ہی کے گھاٹ اُترتے ہیں

بہت مشکل ہے ترکِ آرزو انساں کو دُنیا میں
جو یاں ناکام رہتے ہیں وہی کچھ کام کرتے ہیں

ہے نام کوہکن لے جانِ شیریں آج تک زندہ
وہی جیتے ہیں[1] اپنی موت سے پہلے جو مرتے ہیں

[1] موتوا قبل ان تموتوا۔

نہ مطرب کی ضرورت ہے، نہ قوالوں کی حاجت ہے

صدائے[1] آبِ جو پر بھی یہاں تو وجد کرتے ہیں

بسنت آئی، بہار آئی، جنوں کے ولولے دیکھو!

مرا خوں کھولتا ہے جب پپیہے شور کرتے ہیں

زباں روکے رہو، تلوار چل جائے تو چل جائے

جو دل[2] میں زخم پڑ جاتے ہیں مشکل سے وہ بھرتے ہیں

ہوا کے دوش پر جاتے ہیں بامِ یار تک اُڑ کر

ترے خطِ تمسّک مرغِ نامہ بر کے پر کترتے ہیں

۵۷
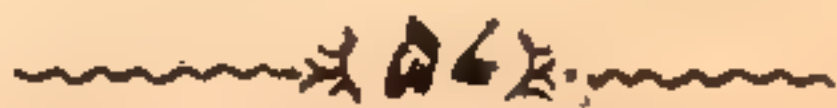
نہیں مانتا یہ کسی طرح دلِ نابکار کو کیا کروں ؟

تیری چشمِ مست کو کیا کروں، لبِ میگسار کو کیا کروں!

---

[1] بہ آواز دولاب مستی کنند (سعدی) [2] جراحات السنان لہا التیام ٭ ولا یلتام ما جرح اللسان۔

غمِ دہر کا میں رہا ہدف، ہوئی عمر ساری یوں ہی تلف
ہے چمن میں لالہ بسوز کف ، اثرِ بہار کو کیا کروں؟

یہی تھا ارادہ کہ عمر بھر، نہ پیوں گا بادہ کبھی مگر
تری چشمِ مست کی فتنہ گر! مئے خوشگوار کو کیا کروں؟

میں ہزار دل کو موں روکتا، اسے ہر قدم پہ ہوں ٹوکتا
ترے ناز و غمزہ کے دل ربا! فنِ سحر کار کو کیا کروں؟

ترا اگرچہ لطف خفی رہا، مرا دل اسی سے قوی رہا
مرا حال پھر بھی وہی رہا، غمِ روزگار کو کیا کروں؟

مرے پاس ایسا کہاں مکاں، کہ بلاؤں ان کو میں میہماں
وہ بشوق آئیں برون جاں، دلِ داغدار کو کیا کروں؟

وہ چلے تو پڑھتے ہوئے فاتحہ، مگر آکے ہو گئے دو دلہ
ہے زمینِ گور کو زلزلہ، دلِ بے قرار کو کیا کروں؟

نہ تو پاس وعدہ وعید کا، نہ تو ٹھیک قول و قرار کا
تجھے شمسؔ ان پہ ہے اعتبار؟ اس اعتبار کو کیا کروں؟

﴿۵۸﴾

اُٹھائے ہیں بہت دُکھ میں نے فرزانوں کی دنیا میں
رہا ہوں اس لئے اب آکے دیوانوں کی دُنیا میں

عجب ہنگامہ عالم میں ہے داناؤں کی دانش سے
سکونِ دل اگر کچھ ہے تو نادانوں کی دُنیا میں

حقیقت تلخ ہے اس سے مفر ممکن نہیں، لیکن
پناہ آخر کو ڈھونڈھی میں نے افسانوں کی دنیا میں

حقیقت پوچھئے کیا ہو؟ حقیقت مختصر یہ ہے
درندے بیشتر بستے ہیں انسانوں کی دُنیا میں

لہ کانکے (رانچی) جہاں دماغی امراض کا شفاخانہ ہے اور حقیقت میں وہ دارالمحن ہے۔

کہاں وہ سادگی ان کی کہاں وہ حسنِ خلق اُن کا!
یہ کس ظالم نے بو یا زہر دہقانوں کی دنیا میں؟
سکونِ قلب اکثر جھونپڑوں میں میں نے پایا ہے
بہت کمیاب ہے یہ چیز ایوانوں کی دنیا میں
چلو اے شمسؔ جنگل کی طرف کچھ دل بہل جائے
بڑی آبادیاں پنہاں ہیں ویرانوں کی دنیا میں

۵۹

تم نہیں ملتے تو کیا، ہم جستجو رکھتے تو ہیں
تم نہیں آتے تو کیا، ہم آرزو رکھتے تو ہیں
اب بھی کشتِ دل کی سیرابی نہ ہو تو کیا کریں
دونوں آنکھوں سے رواں ہم آبجو رکھتے تو ہیں

کیا کہیں جب شیخ جی تکفیر پر ہیں مستعد
ورنہ ہم اس باب میں کچھ گفتگو رکھتے تو ہیں

مجھ کو تڑپانے کی دُھن، مجھ کو ستانے کا خیال
مت مکرئیے، آپ بھی کچھ آرزو رکھتے تو ہیں

شیشۂ دل میں اُترتا ہی نہیں عکسِ جمال
ہم تصوّر تیرا اے آئینہ رو رکھتے تو ہیں

تو اُٹھاتا ہی نہیں چہرے سے فانوسِ حجاب
سوزشِ پروانہ ہم اے شمع رو رکھتے تو ہیں

شمع نے فانوس اوڑھی، یار نے ڈالی نقاب
شوقِ روپوشی بظاہر شعلہ رو رکھتے تو ہیں

کیوں نکلتے ہیں سفید آنسو کسی کی آنکھ سے؟
رونے والے جسم میں آخر لہو رکھتے تو ہیں

کیا عجب، چمکیں عقیق سُرخ ان آنکھوں سے تمھ
ان رگوں میں ہم یمن کا کچھ لہو رکھتے تو ہیں

۶۰

حسن والے میری صورت پہ ہنسا کرتے ہیں
آپ اچھے ہیں مگر یہ تو بُرا کرتے ہیں
دیکھئے حالت بیمار، یہ کیا کرتے ہیں؟
آگیا وقت دُعا، آپ دوا کرتے ہیں!
ان ہی آنکھوں کو شب وصل لجاتے دیکھا
کیسے ان شوخ نگاہوں سے حیا کرتے ہیں؟
خوش نصیبی تو ذرا دیکھئے، معشوقوں کی
قیدیٔ دامِ محبت کو رہا کرتے ہیں

پھر بہار آئی ہے، آ جاؤ ذرا سیر کو تم
سینہ چاکانِ چمن زخم کو وا کرتے ہیں

آج ہم غنچۂ دل صحنِ چمن میں رکھ کر
آزمائش تری اے بادِ صبا کرتے ہیں

اُن کے بننے کی ادا شمسِ منیری مت پوچھ
جو بگڑنے میں بھی سو طرح بنا کرتے ہیں

۱۶۱

گلشن میں بھی ہیں اگر آزادی کی رسمیں
مُرغانِ چمن بیٹھیں گے جا جا کے قفس میں

اب جا کے کھلا ہم پہ کہ پر بند ہیں اب تک
نکلے تو تھے ہم جال سے اُڑنے کی ہوس میں

سو بار ہیں ہم عہد وفا کے لئے حاضر
فرمائیے جو حکم ہو، ہیں آپ کے بس میں
بھٹکا ہوا ہے دشت میں کیا "قافلہ کوئی"؟
کیوں درد بھری لے ہے یہ آوازِ جرس میں؟
کیا بیٹھے ہیں صدیوں کے بنانے کو یہ نقشے!
دنیا ہی بدل جائے گی دس پانچ برس میں
اس لُطف و مراعات کی کیوں کر نہ کریں قدر
صیّاد نے پر کھول کے رکھا ہے قفس میں
شائد نظر آجائے کوئی طائرِ آزاد
صیّاد! بنا دے کوئی روزن ہی قفس میں
جیسے انہیں ملنے کو ہے اب جنّتِ موعود
بیٹھے ہیں ہوس پیشہ کس اندازِ ہوس میں!

کیا حال غریبوں کا کہیں شمس منیری!

ہو دل سے خوش، ایسا نہیں یاں ایک بھی دس میں

(۶۲)

حاصل[1] کارگہ کون و مکاں کچھ بھی نہیں

سچ تو یہ ہے کہ یہ اسباب جہاں کچھ بھی نہیں

ایک[2] بلبل کہ ہے گلشن کو اٹھائے سر پہ

ایک پروانہ، کہ فریاد و فغاں کچھ بھی نہیں

شیخ جی لائے ہیں تشریف، انہیں بھی اک جام

مہمانوں کے لئے پیر مغاں کچھ بھی نہیں؟

---

[1] حاصل کارگہ کون و مکاں ایں ہمہ نیست ؛ بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست (حافظ)

[2] اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز ؛ کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد (سعدی)

اُس نگاہ غلط انداز کے صدقے ظالم

جس میں سب کچھ ہی نہاں اور عیاں کچھ بھی نہیں

بدگمانی کا محبت میں نہ پوچھو کچھ حال

یوں بہت سے ہیں گماں، اور گماں کچھ بھی نہیں

صرف حلوے کی گزک ہی یہ قناعت اے شیخ!

اور ساماں ابھی بہرِ رمضاں کچھ بھی نہیں؟

ہم تو قائل ہیں اسی سوزِ نہاں کے اے شمس

دل میں ہے آگ مگر لب پہ دھواں کچھ بھی نہیں

۶۳

آنسو ہیں ڈبڈبائے ہوئے چشمِ یار میں

موتی بھرے ہیں دامنِ ابرِ بہار میں

ہر نونہال باغ کا سینہ ہے داغ داغ
کیا ہو گیا ہے سب کو الٰہی! بہار میں؟

وہ کون سا حسین ہے جو مجروحِ دل نہیں؟
دیکھو تو کتنے داغ ہیں اس لالہ زار میں

پھرتے ہیں روز و شب تری آنکھوں کی یاد میں
ہم مبتلا ہیں گردشِ لیل و نہار میں

کیسے سمٹ کے بیٹھے ہیں آنچل سنبھال کے
کیا ولولے اُٹھیں دلِ اُمیدوار میں!

ہے آج لال لال شفق خون کی طرح
نشتر لگا ہے کیا رگِ ابرِ بہار میں؟

اس شوخ سا ہمیں نظر آیا نہ کوئی شخص
دس بیس میں، پچاس میں، سو میں، ہزار میں

﴿۶۴﴾

ذرا برسات میں رنگِ زمین و آسماں دیکھو!

وہ فرشِ مخملی پر لوٹتی ہیں بدلیاں، دیکھو!

لبِ دریا چلو، کیفیتِ آبِ رواں دیکھو!

وہ مستانہ روش موجوں کی، وہ اٹکھیلیاں دیکھو!

چلی جاتی ہے غصّہ میں بھری فوجِ گراں، دیکھو!

وہ موجیں پے بہ پے، خنجر بکف کف در دہاں دیکھو!

میانِ سبزۂ وادی ہے اک جوئے رواں دیکھو!

اتر آئی زمیں پر آسماں سے کہکشاں دیکھو!

زمیں سے آسماں تک کیف مستی کا سماں دیکھو!

لنڈھاتی پھر رہی ہیں خم کے خم یہ بدلیاں، دیکھو!

ہوئی جاتی ہے دُنیا پھر نئے سر سے جواں دیکھو!
پھٹا پڑتا ہے جوبن جس طرف دیکھو جہاں دیکھو!
پئے تفریح نکلا گھر سے ہر پیر و جواں دیکھو!
نظر جس شخص پر پڑتی ہے وہ ہے شادماں، دیکھو!
ہے کالے دیو کے آغوش میں نیلم پری گویا
پہاڑوں پہ جھکی ہیں کالی کالی بدلیاں، دیکھو!
اُچھلتے ہیں وہ فوّارے غضب کے آبشاروں سے
اُبلتی آرہی ہیں یہ پہاڑی ندّیاں دیکھو!
کھِلا جاتا ہے جوبن شاہدِ فطرت کا نظروں میں
پہاڑوں کے اُٹھان اور ان کی یہ زیبائیاں دیکھو!
عزیزو! آؤ، تم بھی کیفِ موسم کے مزے لے لو
ہوا شمس منیری بعد مدّت نغمہ خواں، دیکھو!

﴿۶۵﴾

تھوڑی ہے عمر مستعار، کھاؤ پیو مزے کرو
کچھ نہیں اس کا اعتبار، کھاؤ پیو مزے کرو

باغ میں نعرہ زن کبھی، دشت میں خیمہ زن کبھی
آج ہے سیرِ کل شکار، کھاؤ پیو مزے کرو

جام شراب چشمِ یار، سیب و انارِ حسنِ یار
یار سے ہو کے ہمکنار، کھاؤ پیو مزے کرو

سیخ کباب، جام مے، چاہئیں آج دونوں شے
نقد نہ ہو تو لو اُدھار، کھاؤ پیو مزے کرو

فکرِ جہاں فضول ہے کیوں میری جاں ملول ہے؟
غم سے ہے سینہ کیوں فگار؟ کھاؤ پیو مزے کرو

عمر یہ چند روزہ ہے، کوئی کسی سے کیوں لڑے
دل سے نکال دو غبار، کھاؤ پیو مزے کرو

عابد شب گزار بھی، زاہد روزہ دار بھی
عیش کے ہیں اُمیدوار، کھاؤ پیو مزے کرو

دل ہے اگر توکلی، کیوں ہے جہاں کی بے کلی
کم ہے یہاں بھی کیا بہار، کھاؤ پیو مزے کرو

صوفی و شیخ مست ہیں، رند بھی مے پرست ہیں
تم کو ہے کیا پھر انتظار؟ کھاؤ پیو مزے کرو

کوئی سرور پر مٹا، کوئی ظہور پر مٹا
سب ہیں یہاں تو بادہ خوار، کھاؤ پیو مزے کرو

وعدۂ خلد ہے اُدھار، نقد یہاں ہی کاروبار
شمس کہاں تک انتظار؟ کھاؤ پیو مزے کرو

۶۶

کبھی ہم سے قول و قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی چاہ بھی کبھی پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی تھا زمانہ شباب کا، کبھی تھا بہانہ حجاب کا
کبھی پرنے پرفے میں پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی شدتِ گرمیِ خون بھی تھا کبھی عہدِ زورِ جنوں بھی تھا
کبھی جوشِ فصلِ بہار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی عارضوں میں نکھار تھا کبھی جوبنوں میں اُبھار تھا
کبھی لُطفِ بوس و کنار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی جنگلوں میں قرار تھا، کبھی شغل سیر و شکار تھا
کبھی لُطفِ لیل و نہار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تمہیں گل پہننے سے عار[1] تھا، کوئی دل پسند جو ہار تھا
تو وہ میری باہنوں کا ہار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مجھے بہت تمہارے بھی مدعی دم امتحاں نہ رہا کوئی
یہی ایک شمس نزار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۶۷

تڑپتا ہے کسی کا کس طرح دل، دیکھتے جاؤ
نہ دیکھا ہو تو آؤ، رقص بسمل دیکھتے جاؤ

وہ دیکھو! پیچھے پیچھے چاک اُڑاتا کون آتا ہے!
اُٹھا کر پردہ دنبال محمل دیکھتے جاؤ

پڑے ہیں چند تنکے منتشر صحن گلستاں میں
کسی کی آشیاں بندی کا حاصل دیکھتے جاؤ

[1] عار کو مؤنث بھی لکھتے ہیں۔

تمنّا اِک نظر کی تم سے رکھتا ہے کوئی بسمل

یہ کس کی تیغِ ابرو کا ہی گھائل ! دیکھتے جاؤ

شہیدانِ محبّت کے پڑے ہیں جا بجا لاشے

یہی تو ہیں نشانِ راہِ منزل دیکھتے جاؤ

بھڑی ہی کس کی کشتی جا کے امواجِ حوادث سے

اُدھر بھی عافیت خواہانِ ساحل دیکھتے جاؤ

کبھی اس شان سے دیکھا نہ ہوگا اپنے مجنوں کو

ذرا آرائشِ طوق و سلاسل دیکھتے جاؤ

یہ بزمِ مے ہے یاں صدق و صفا ہی حضرتِ واعظ!

کوئی دم یاں بھی ٹھہرو رنگِ محفل دیکھتے جاؤ

کبھی جامہ دری ہے اور کبھی ہی خود فراموشی

یہ ہیں شمسِ منیری کے مشاغل دیکھتے جاؤ

۶۸

جوبن[1] بچاؤ تاک لگائے نظر نہ ہو
یہ چور وہ ہے مال چُرائے خبر نہ ہو

یا رات ختم ہوتے نہ پائے سحر نہ ہو
یا وصل ہی میں دن نکل آئے خبر نہ ہو

اس بادیہ نشیں کی فراغت نہ پوچھئے
جو اپنے گھر پہ لوٹ کے آئے تو گھر نہ ہو

جب سے نہیں ہے دل میری تکلیف کم سی ہے
اللہ کرے کہ وہ بھی دن آئے جگر نہ ہو

خرقہ مرا کہ خشک بھی ہے داغ داغ بھی
دامن ترا کہ بھیگ بھی جائے تو تر نہ ہو

[1] غزل ذو قافیتین۔

آنسو کہیں کچھ اور، کہ ہوتی نہیں ہے قدر
جب تک صدف میں نشو و نمائے گہر نہ ہو

جوشِ جنوں سے تنگ ہے شمسؔ شکستہ پا
اللہ اُسے وہ دن بھی دکھائے کہ سر نہ ہو

۴۹

نگاہِ ناز اُٹھی تھی کسی کے دل میں جانے کو
جُھکیں پلکیں یکایک راہ میں کانٹے بچھانے کو

ہوئی ہے ہجر میں آدھی ملاقات اس طرح پُوری
منگایا ہم نے اُن کا خط کلیجے سے لگانے کو

رہی زاہد کو شغلِ ذکر میں پیشِ نظر جنّت
کہیں مزدور بھی بھولا ہے اپنے محنتانے کو!

ملک کو دی فراغت عیش بخشا ہے بہائم کو
ہمیں اک رہ گئے تھے یا الٰہی غم اٹھانے کو؟

حیا ہے، نازکی ہے، کمسنی ہے، تم ہی بتلاؤ
کہ مانوں کس بہانے کو نہ مانوں کس بہانے کو

انہیں روکو کہ گورستاں میں اک محشر بپا ہوگا
مجھے روٹھا سمجھ کر آ رہے ہیں وہ منانے کو

ابھی مصروف مشاقی ہے نقاش ازل شاید
کہ جو صورت بنائی ہے بنائی ہے مٹانے کو

حیا کچھ اور کہتی ہے، ادا کچھ اور کہتی ہے
مرا دل آزمانے کو، مری ہمت بڑھانے کو

زرِ خالص بنے گا شمسؔ یوں ہی نقد قلب اپنا
کسی کی نذر کر دیں آتش غم سے جلانے کو

(۶۰)

غضب ہے آج تو یہ چشم سُرمہ سا دیکھو
نظر جُھکاؤ، قیامت نہ ہو بپا، دیکھو!
تڑپ رہا ہے ابھی بِسمل ادا دیکھو
بس ایک تیر نظر اور آزما دیکھو
چلائے جاؤ تم اپنی زبان کا خنجر
ابھی مرے دل مضطر کا حوصلا دیکھو
پہنچ ہی جائے گی ساحل پہ کشتیِ ہستی
خدا کے واسطے مت عوئے ناخدا دیکھو
پہنچ کے دامنِ رنگیں تک اس کے بڑھ نہ سکا
رُکا ہے جا کے کہاں دست نارسا، دیکھو!

نگاہِ غیظ کا ان کی یہ اب اشارہ ہے

یہاں کھڑے نہ رہو، اپنا راستا دیکھو

کہیں غریب کلیجا پکڑ کے بیٹھ نہ جائے

تم اس طرح نہ سوئے شمس مبتلا دیکھو

۱۷

کر نہ دے بیخودیِ شوق کہیں گم مجھ کو!

اس طرح پیار سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو

تیری خاطر ہمیں منظور ہے، مایوس نہ ہو

کہ رہا ہے یہ اشارے سے تبسّم مجھ کو

لن ترانی کی صدا سُن کے تڑپ جاتا ہوں

لئے جاتا ہے کہاں ذوقِ تکلّم مجھ کو!

ہر گلِ تر میں عیاں ہے کسی رخسار کا رنگ
ہر کلی میں نظر آتا ہے تبسم مجھ کو

ہر چمن چھوتے اشجار ہے اک بزمِ طرب
ہر لبِ جُو ہے لبِ سازِ ترنم مجھ کو

جوئباروں میں ہے مستانہ خرامی کی ادا
منظرِ رقص ہے موجوں کا تلاطم مجھ کو

شکر اے شمسؔ قناعت کی ہے دولت حاصل
روکھی سوکھی میں بھی ہے لطفِ تنعم مجھ کو

۴۲

مقصد کی ہے تلاش نہ منزل کی آرزو
اک سعیِ ناتمام ہے بس دل کی آرزو

مقصود کشت و کار سے دعوت ہے برق کی
خرمن کی یاں طلب ہے نہ حاصل کی آرزو

گلکاریاں کفن میں ہوں چھینٹوں سی خون کے
رنگین ہے بہت ترے بسمل کی آرزو

اے اضطراب دل! تجھے لیجاؤں میں کہاں؟
منزل پہ بھی پہنچ کے ہے منزل کی آرزو

لو! چھوڑتا ہوں کشتیٔ دل بحر شوق میں
ساحل سے لے چلی مجھے ساحل کی آرزو

یہ طنز ہے کہ واقعہ؟ کہتے ہیں ہنس کے وہ
"ہم کو بھی ہے عزیز ترے دل کی آرزو"

منزل نہ کر تلاش، کہ ہے ہر قدم پہ شمس
ذوقِ طلب کو دوریٔ منزل کی آرزو

(۴۳)

دریوزہ گردِ نازِ بتاں در بدر نہ ہو
آوارہ اے جبینِ نیاز اس قدر نہ ہو

واعظ کو ذکرِ حور میں کیسا ہے انہماک!
کوئی حسین اور بھی مدِ نظر نہ ہو

پردیس ہی کو دیس سمجھ لے نہ کیوں غریب
جس کا کہ اپنے دیس میں بھی کوئی گھر نہ ہو

پہلو میں دل نہیں ہے مگر ہے کھٹک وہی
اے چارہ ساز! یہ کہیں دردِ جگر نہ ہو

آنکھیں ہماری سُرخ ہیں، تلوے حضور کے
دونوں جگہ یہ سُرخیٔ خونِ جگر نہ ہو

طولِ شبِ فراق کی ضد ہی سہی، مگر
اتنی بھی اے وصال کی شب مختصر نہ ہو
اس صاحبِ شعور کو اے شمسؔ کیا کہوں!
فصلِ بہار میں بھی جو شوریدہ سر نہ ہو

﴿۴۷﴾

میری نظروں سے بہت گزریں بہار رنگ و بو
اس چمن میں کچھ نہیں ہے اعتبار رنگ و بو
وہ بہار تو جوانی ہے بہار رنگ و بو
دست قدرت کا ہے گویا شاہکار رنگ و بو
گُل سے وہ رخسار آنکھیں نرگسی، لب لالہ رنگ
اس سراپا ناز کو کہئے نگار رنگ و بو

حسن اس کافر کا ہے گویا بہار بے خزاں
ہے اسی کی ذات سے کچھ اعتبار رنگ و بو

جذبۂ صورت پرستی فطرت انساں میں ہے
ہے خمیر زندگانی سازگار رنگ و بو

اس خزاں دیدہ چمن میں حسن گل کو کیا قیام
عشق بلبل سے فقط ہے اعتبار رنگ و بو

اس گلِ تر کی نزاکت کا بیاں کیا کیجئے
جس کی زینت سے نہیں اٹھتا ہے بار رنگ و بو

مجھ میں اس میں کوئی نسبت ہے اگر تو بس یہی
میں گدائے حسن، وہ سرمایہ دار رنگ و بو

شمسؔ اس گل پیرہن کی دیکھ کر آرائشیں
چاہتا ہے جی کہ ہو جاؤں نثار رنگ و بو

﴿ ۷۵ ﴾

ہوں گنہگار، بد اعمال، الٰہی توبہ
ہے مرا سخت زبوں حال، الٰہی توبہ

جسم ہی صرف نہیں یعنی محلِ امراض
قلب کا بھی ہے بُرا حال، الٰہی توبہ

ہے عزیزوں کی علالت سے بھی اندیشہ و فکر
ہے عجب طرح کا جنجال، الٰہی توبہ

گتھیاں ہیں کہ سلجھتی نہیں سلجھائے سے
ہے ہر اک بات میں اشکال، الٰہی توبہ

مجھ کو اور میرے عزیزوں کو عطا کر صحت
ٹھیک کر دے مرے احوال، الٰہی توبہ

شمسؔ کو بخش وہ قوت کہ پھر اُس پر نہ رہے
غلبۂ نفسِ بد اعمال، الٰہی توبہ

(۷۶)

تمنا دید کی کب بے دلوں کے دل سے نکلے گی
بہت مدت رہی ہے بڑی مشکل سے نکلے گی

دعا ہو، بد دعا ہو کچھ تو میرے حق میں فرمائیں
زباں سے اُن جو نکلے گی وہی یا دل سے نکلے گی

اگر یوں ہی رہے گا سلسلہ یہ آنے جانے کا
ہماری لاش اک دن کوچۂ قاتل سے نکلے گی

نہیں معلوم اُن کے دشمنوں کا حال کیا ہوگا!
ہماری لاش خستہ جب بھری محفل سے نکلے گی؟

یہ مانا تم لگا کر تیر اس کو کھینچ لو گے پھر
مگر اس کی کھٹک کیونکر دلِ بسمل سے نکلے گی؟

پڑے گا عکس جب اس شعلہ رو کا آبِ دریا میں
صدائے العطش پیہم لبِ ساحل سے نکلے گی

چھپی بیٹھی ہے خم میں دخترِ رز یاں منتظر ہیں ہم
یہ لیلیٰ ساقیا! کب پردۂ محمل سے نکلے گی؟

خوشی سے تم ستا لو بیکسوں کو جتنا جی چاہے
تمہارے حق میں کوئی بددعا کس دل سے نکلے گی

گدائے حسن ہے شمس منیری کچھ دعا لے لو
اثر دکھلائے گی اس کی دعا جب دل سے نکلے گی

۷۷
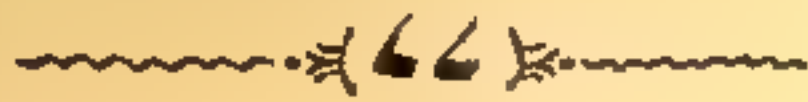
بے چین ہو کے ذکرِ شب انتظار سے
لپٹے وہ باہیں ڈال کے گردن میں پیار سے!

آنکھیں بھی، آستین بھی، دامن بھی سرخ ہیں
آیا ہے دل کسی پہ مرا کس بہار سے

آئینہ آئینے سے بھی کرتا ہے کسب عکس
رخ ہے مکدّر آپ کا دل کے غبار سے

اُف! اے نگاہِ غیظ، دھڑک کر یہ رہ گیا
کیا تو نے کہہ دیا دلِ اُمیدوار سے؟

پہلی سی پوچھ گچھ ہے نہ پہلی سی دیکھ بھال
کچھ ہو گئے ہیں اب تو وہ غفلت شعار سے

مدفون حسرتیں نکل آئی ہیں، زندہ جائیں!
چلیے حضور بچ کے ذرا لالہ زار سے

اے شمسؔ کس کی بزم میں جاگے ہو رات بھر؟
آنکھیں ہیں لال لال تمہاری خمار سے!

(۷۸)

کھلے ہیں لالہ و گل، یا تماشہ گاہ حرماں ہے؟
کہیں ہے داغ دل روشن، کہیں چاک گریباں ہے

مری آنکھیں ابھی شبنم فشانِ خونِ حسرت ہیں
مرا دامن ابھی گلشن فروشِ داغِ عصیاں ہے

ہمارا حال ان دونوں میں گھر کر دیکھیے کیا ہو!
ادھر برگشتہ قسمت ہے، ادھر برگشتہ مژگاں ہے

نگاہیں اُن کے رخساروں سے ہیں مصروفِ گل چینی
ہمارا آج ہر تارِ نظر گلشن بداماں ہے

سیاہی کثرتِ سبزہ کی، اس میں جلوہ پھولوں کا
فروغِ لالہ و گل سے گلستاں میں چراغاں ہے

چھپا رکھا ہے سینے میں تمنے داغِ محبت کو
یہ طوفانِ حوادث میں چراغِ زیرِ داماں ہے

کہو شمس منیری سے کہ وحشت کی دکاں کھولے
خریدارِ جنوں پھر وہ نگاہِ فتنہ ساماں ہے

۷۹

کہیں نہ تیغِ ادا بے نیام ہو جائے
کہیں نہ مُفت میں اک قتلِ عام ہو جائے

نگاہ لطف بتوں کی جو عام ہو جائے
تو اُن کی ساری خدائی غلام ہو جائے

جو تیری اک نگہ ناتمام ہو جائے
تو شیخ قائل شرب مدام ہو جائے

ستم ہے! پھیر لیا مُنہ، دکھا دیئے گیسو
کہ اور پختہ یہ سودائے خام ہو جائے

کہاں وہ اور کہاں ہم، یہی غنیمت ہے
کہ دور ہی سے ہمارا سلام ہو جائے

نہ پوچھ حسرتِ صبح وطن بچاروں کی
کہ جن کو وادیٔ غربت میں شام ہو جائے

ابھی سے آنکھ میں رندوں کے لال ڈورے ہیں
غضب ہو اور جو اک دور جام ہو جائے

آخر وقت نظر بھر کے دیکھ لے ساقی!
کہ تیرے مست کا لبریز جام ہو جائے
تو ایسے درد سے روتا ہے شمس راتوں کو
کسی کی نیند نہ ظالم حرام ہو جائے!

۸۰

ہر شے میں تجسس حسن کا ہے، کیا آنکھ ہے میری کیا کہیے
کمبخت کو صورت دیکھنے سے ہوتی نہیں سیری، کیا کہیے
وہ جوش جنوں، وہ شورش دل، وہ ٹھوکریں راہِ اُلفت میں
وہ اپنی جوانی دیوانی! وہ رات اندھیری! کیا کہیے
ہیں سارے دفینے ہم پہ عیاں، ہیں سارے خزینے ہم پہ کھُلے
رکھی ہے چھپا کر تم نے جہاں وہ حسن کی ڈھیری، کیا کہیے

اس بزم شبینہ کے نقشے سب بدلے صبح پیری نے
دل اب تک یہ ہی سمجھتا ہے ، ہے رات اندھیری کیا کہیے

تعمیر کی کوشش کی ہم نے ، تخریب نتیجہ نکلا ہے
دیوار ہے خم، چھلنی چھپر، ٹوٹی ہے بڑیری ، کیا کہیے

کیا رنگ زمانہ بدلا ہے ، کیا غیروں کی بن آئی ہے
جو کل تک تھے رو باہوں میں، آج ان کی شیری کیا کہیے

وہ قلب نہیں، وہ جسم نہیں، وہ جوش نہیں، وہ زور نہیں
اب عہد جوانی کی باتیں، اے شمس منیری کیا کہیے

۸۱

جو دل میں کسی بت کی تمنا نہیں رکھتے
وہ دل نہیں رکھتے، وہ کلیجا نہیں رکھتے

ہم خاک پہ کر لیتے ہیں سجدہ ترے آگے
زاہد کی طرح پاس مصلّٰی نہیں رکھتے

بازار کی پریاں بھی کوئی چیز ہیں اے بُت؟
یاں حُور بھی آجائے تو پروا نہیں رکھتے

کافی ہے تری چشمِ عنایت ہمیں، ساقی!
ہم عادتِ شغلِ مے و مینا نہیں رکھتے

دل بھی ہے بُری چیز، کسی کو اسے دیدیں
اچھّے ہیں جو پاس اپنے یہ جھگڑا نہیں رکھتے

ناصح تمہیں کیا، میں نے دیا دل جسے چاہا
کچھ تم تو مرے دل کا اجارا نہیں رکھتے

اے شمسؔ وہ تنہا ہے، کلیجے سے لگا لو
اتنا بھی مرے یار کلیجا نہیں رکھتے!

﴿ ۸۲ ﴾

چمن کی خاک سے خوباں لالہ رُو نکلے
اب آئی فصل، کہ پھر شیشہ و سُبو نکلے

سحر کی اوس سے کر کر کے شُست و شو نکلے
نکھر کے لالہ و گل، کیسے تازہ رو نکلے!

وہ، جن کے شوق میں ہم بہرِ جستجو نکلے
پتا ملا تو قریبِ رگِ گلو نکلے

تری فلاح سفر میں ہے روزِ اوّل سے
خدا کرے کہ وہ دن ہو، یہاں سے تو نکلے

نکل کے ہم نے معطّر کیا مشامِ جہاں
چمن سے اہلِ محبّت برنگِ بُو نکلے

ہمیں تو جذبِ محبت کا دیکھنا تھا اثر

یہ آرزو ہی نہیں تھی کہ آرزو نکلے

نگاہِ لطف کا ان کی ملا جو سر رشتہ

تھے جتنے چاک جگر قابلِ رفو نکلے

سمجھ کہ ہو گئی عہدِ حیات کی تجدید

رگِ گلو سے ترے گر کبھی لہو نکلے

ہوا جو اہلِ طہارت کا امتحاں اے شمسؔ

جنابِ شیخ بھی مسجد میں بے وضو نکلے

(۸۳)

لوگ کہتے ہیں کہ مانگے سے سوا ملتا ہے

ہم بھی دیکھیں، تری درگاہ سے کیا ملتا ہے!

رہروِ راہِ محبت کا سفر ہے تنہا
اتفاقاً کوئی اس راہ میں آ ملتا ہے

رہزنی کرتے ہیں بن بن کے خضر کی صورت
اب تو مشکل سے کوئی راہنما ملتا ہے

چھوڑ جاتے ہیں جسے ملکِ عدم کے راہی
وہ پھر اُس قافلے سے دوڑ کے جا ملتا ہے

عشق صادق ہے تو مل جائے گا مطلوب ضرور
ڈھونڈتے ڈھونڈتے والوں کو خدا ملتا ہے

صبح آتی ہے کدھر سے یہ شمیمِ گیسو؟
کچھ پتا تجھ کو بھی اے بادِ صبا، ملتا ہے؟

کیا اسی دشت میں ہے منزلِ مقصود کہیں؟
جا بجا قیس کا نقشِ کفِ پا ملتا ہے!

کس سے پوچھے کوئی اُس جانِ دو عالم کا پتا؟
آپ کھو جاتے ہیں وہ جن کو پتا ملتا ہے
شمس[1] کو آپ نے اس راہ میں دیکھا ہوگا
وہ جو اک خاک نشیں بے سر و پا ملتا ہے!

(۸۴)

کس طرح کھولوں الٰہی وہ گرہ جو دل میں ہے؟
ناخنِ خنجر کہاں، وہ تو کفِ قاتل میں ہے
نور تیرا آنکھ میں ہے، درد تیرا دل میں ہے
سچ بتا اے دردِ جانِ قیس! کس محمل میں ہے؟
ہم نے سمجھا ہر حصولِ مدعا کے بعد یہ
حاصلِ عمرِ عبث اک سعیِ بے حاصل میں ہے

[1] آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد (سعدی)

عشق شور انگیز، اک شورش میں جا پہنچا کہاں
عقل دور اندیش، کس اندیشۂ باطل میں ہے؟

زندگی کی راحتیں ہیں سعی پیہم میں نہاں
جو سفر میں ہے یہاں گویا وہی منزل میں ہے

بزم میں فرہاد سے شیریں ہے گرم اختلاط
قیس کی لیلیٰ ابھی تک پردۂ محمل میں ہے!

رہ نہ جائے دل کی دل ہی میں، یہ ہے وقت اخیر
شمسؔ کو کہنے دے ظالم جو کچھ اس کے دل میں ہے

(۸۵)

یہ آج کیا ہے کہ طبع پژمردہ رنگ پیہم بدل رہی ہے؟
مچل مچل کر سنبھل رہی ہے سنبھل سنبھل کر مچل رہی ہے

یہ آج کیا ہے کہ چین بالکل نہیں ہے قلب سکوں طلب کو؟

یہ آج کیا ہے کسی کی چٹکی دلِ فسردہ پہ چل رہی ہے؟

یہ آج کیا ہے کہ باغ جاں میں کلی کھلی ہے تو خون ہو کر؟

یہ آج کیا ہے کسی کی انگشت غنچہ دل کو مل رہی ہے؟

یہ آج کیا ہے کہ میٹھا میٹھا سا درد سینے میں ہو رہا ہے؟

یہ آج کیا ہے بغل میں بیٹھی کوئی کلیجا مسل رہی ہے؟

فضائے ذہنی میں شورشِ جاں سے سخت طوفان اُٹھ رہے ہیں

دماغ کے سنگلاخ سے اک سخن کی ندی اُبل رہی ہے

جو پیڑ کل تک تھے خشک اُن میں نئے شگوفے نکل رہے ہیں

ہوائیں پھاگن کی چل رہی ہیں جہان کی رت بدل رہی ہے

درخت پھولوں سے لد رہے ہیں، لگی ہے جنگل میں آگ گویا

اس آتشِ گل پہ اپنا دامن نسیم جاں بخش جھل رہی ہے

ہرن بیاباں میں پھر رہے ہیں چمن میں چڑیاں چہک رہی ہیں
صبا ہزاروں نزاکتوں سے روش روش پہ ٹہل رہی ہے
کہیں تو کوکو سے کوئلوں کی جنوں مزاجوں میں بڑھ رہا ہے
کہیں پپیہے کی پی کہاں سے چھری کلیجوں پہ چل رہی ہے
ہے شام کا وقت کیا سہانا، ہوا کے جھونکے ہیں رُوح پرور
درخت مستانہ جھومتے ہیں، مٹی مٹی دھوپ ڈھل رہی ہے
یہ وقت تنہائی ہو کا عالم، نہ کوئی مونس نہ کوئی ہمدم!
مگر طبیعت ہے شمسؔ تیری کہ شاعری سے بہل رہی ہے

(۸۶)

مرے غم الم کو نہ پوچھئے مجھے چین ہے نہ قرار ہے
ہے خزاں رسیدہ ریاض دل، مجھے کیا امید بہار ہے؟

مرے دل کا غنچہ کھلے اگر، تو شگفتہ باغ ہو سر بسر
مرے عیش و غم کے یہ عکس ہیں، نہ خزاں ہی یاں نہ بہار ہے
اسے ڈھیر خاک کا جان کے نہ مٹا کہ پھر نہ ملے گا یہ
یہ نشان راہ ہے بے خبر کسی راہ رو کا مزار ہے
جو جلائے تجھ کو تو آگ ہے، جو دکھائے راہ تو روشنی
فقط ایک فرق مجاز ہے، وہی نور ہے وہی نار ہے
جسے ہے تلاش سکون دل، جو ہی صلح کل وہ ہے مرد دل
کہیں لڑ پڑے کہیں کٹ مرے، یہی زندگی کی بہار ہے
نہ ہوائے عیش شباب ہے، نہ مذاق چنگ و رباب ہی
مرا دل اسی میں خراب ہے، کہ اسیر سیر و شکار ہے
ہوا غم نصیب اسے یا خوشی، رہی شمس حالت دل وہی
یہی وہ ریاض ہی واقعی، کہ خزاں بھی جس کی بہار ہے

﴿ ۸۷ ﴾

کب تلک[1] دل میں چھپائے غمِ ہجراں کوئی؟

سوچیے اب تو ملاقات کا عنواں کوئی

نظر آتا نہیں گلشن میں بھی شاداں کوئی

وقتِ شیون ہے کوئی چاک گریباں کوئی

یہ نہ پوچھو کہ ہیں آنکھوں کے دریچے کیوں بند

خانۂ چشم میں بے پردہ ہے مہماں کوئی

اب اُسے جاکے منالاؤ تو ہم بھی جانیں

لو! گیا آج سوئے گورِ غریباں کوئی

وادیٔ نجد نہیں، وادیٔ فاراں ہی سہی

شرط ہے راہ میں ہو دشتِ مغیلاں کوئی

[1] تلک بعض شعراء کے نزدیک متروک الاستعمال ہے۔

جگمگا اُٹھے ہیں آنکھوں کے دیے کیوں آج؟
خانۂ دل میں فروکش نہ ہو مہماں کوئی
دھجیاں جیب و گریباں کی اُڑی جاتی ہیں
میری نظروں میں ہے کیا جلوۂ عریاں کوئی؟
آج پھر کلبۂ احزاں کا ستارہ چمکا
آج بننے کو ہے پھر شمع شبستاں کوئی
لے چلا درگہِ رحمٰن میں گنہ کی سوغات
شمسؔ کے پاس نہ تھا اور تو ساماں کوئی

(۸۸)

بہت کم ہیں جمالِ روئے لیلیٰ دیکھنے والے
زیادہ ہیں فقط محمل کا پردا دیکھنے والے

دلِ و دیدہ سے پُوچھے کوئی افسانہ جوانی کا
ابھی باقی ہیں کچھ عہدِ تمنّا دیکھنے والے

کسی کی کشتیٔ جاں ڈوبتی جاتی ہے دریا میں
لبِ ساحل ہیں کیا بے بس! تماشا دیکھنے والے

مزے میں اہلِ ہمّت جھولتے جاتے ہیں کشتی میں
پریشاں ہیں کنارے موجِ دریا دیکھنے والے

میری کشتی کو اے ملّاح چل منجدھار میں لے چل
کہ اس کشتی میں ہیں طوفاں کا رستا دیکھنے والے

بہاراں نے بھریں کیفیتیں پیمانۂ گل میں
سمجھتے کاش فطرت کا اشارا دیکھنے والے

یہیں ہے باغِ جنّت بھی یہیں ہیں حور و غلماں بھی
اگر دیکھیں بہارِ باغِ دنیا، دیکھنے والے

جوانی جب گئی نظریں اُدھر سے پھیر لیں ہم نے
بہت پچھتائے دُنیا کو دوبارا دیکھنے والے
ٹھہر سکتا نہیں شمس میری گھر کے زنداں میں
بہار آئی، چلے دامانِ صحرا دیکھنے والے

۸۹

برف سی سرد ہوائیں ہیں گھٹا چھائی ہے
ساقیا! لا وہ جو دو آتشہ کہلائی ہے
جانے کیا جا کے صبا کان میں کہ آئی ہے؟
پھول ہنستے ہیں، چمن محو خود آرائی ہے
واعظا! مئے ہے، گلستاں ہے، گھٹا چھائی ہے
ذکر فردوس کا بے وقت کی شہنائی ہے

کس قیامت کی جوانی تری گدرائی ہے !
ایک عالم ترے جوبن کا تماشائی ہے !

کس مسیحا کی یہ آمد ہے کہ ملنے کے لئے؟
روح بیمار محبت کی نکل آئی ہے

اور بڑھ جاتی ہے کچھ وسعت صحرائے خیال
بادہ پیمائی مری ، بادیہ پیمائی ہے

اے مسیحا ترے بیمار میں اب دم کیا ہے؟
منتظر آنکھ بڑی دیر سے پتھرائی ہے

قبر پر ترے وحشی کے مجاور ہے صبا
شمع تربت کی جگہ لالۂ صحرائی ہے

دختر رز کو بھی شیشے میں اتارا ہم نے
دیکھئے بزم میں کیا بن کے پری آئی ہے !

مجھ میں اور تجھ میں اگر فرق ہے زاہد تو یہی
میں نے پی، اور طبیعت تری للچائی ہے

دل جو ہے مائل فریاد قفس میں اے شمس
ہو نہ ہو، باغ میں پھر فصل بہار آئی ہے

۹۰

پہنچتا ہے وہیں واعظ جہاں میخانہ ہوتا ہے
"بکار خویشتن ہشیار" ہر دیوانہ ہوتا ہے

جو دیکھو غور سے، عشرت کدہ غم خانہ ہوتا ہے
کہ آنسو ڈبڈبائے بزم میں پیمانہ ہوتا ہے

ہمیشہ سے یہی ہے رسم بازار محبت کی
کہ قیمت اس میں جان تک ہی دل بیعانہ ہوتا ہے

نظر آتے ہیں ان کی بزم میں سب جلنے ہی والے
کہیں پر شمع ہوتی ہے کہیں پروانہ ہوتا ہے

حیا کی پردہ داری اور رعبِ حُسن کا پہرا!
یہیں پر امتحانِ جرأت رندانہ ہوتا ہے

اُچھل کر بام پر چڑھ جاؤں گر سیڑھی نہیں ملتی
ارادہ اب یہی اے ہمّت مردانہ ہوتا ہے

سمجھتا کاش کوئی ساقیِ فطرت کے ایماء کو
شجر کو شاخِ گُل کے ہاتھ میں پیمانہ ہوتا ہے

مرے اشعار کو سُن سُن کے وہ یوں داد دیتے ہیں
ترا ہر شعر رنگیں شمسؔ مشتاقانہ ہوتا ہے

۹۱

دل میں ہے کچھ سرور سا آنکھ میں کچھ خمار ہے
کس کی عنایتوں کا آج شمسؔ امیدوار ہے؟
کون غریب شمسؔ کس کی یاد میں بے قرار ہے؟
کس کی نگاہِ ناز میں سُرمۂ انتظار ہے؟
کس کے عذار ہوں گے سُرخ دل کی شگفتگی سے آج!
کس کے ریاضِ حُسن میں آمدِ نوبہار ہے؟
تیر نظر پہ ہو رہا ہے جو فسان آئینہ
کس کے دل عزیز کا مد نظر شکار ہے!
آیئے اپنے شمسؔ کو آج گلے لگایئے
دردِ فراق سے غریب سخت جگر فگار ہے

﴿۹۲﴾

آ رہی ہے یہ صدا عشق کے میخانے سے
شمسؔ! پیمانِ وفا باندھ لے پیمانے سے

شمع نے ہنس کے کہا رات یہ پروانے سے
غیر کی آگ میں کیا فائدہ جل جانے سے؟

سینہ کاوی ہے عجب چیز، نہ گھبرائے دل!
لعل نکلیں گے کسی دن اسی ویرانے سے

کہیں دبتا ہے دبائے سے بھلا جوشِ شباب:
مئے پر جوش چھلک جاتی ہے پیمانے سے

پھر صبا لائی تری زلفِ معنبر کی لپٹ
اس نے پھر چھیڑ نکالی ترے دیوانے سے

کیا خبر! ہے یہ محبّت کا کہ نفرت کا اثر
نیند اُچٹ جاتی ہے اِن کی مرے افسانے سے
کیا عجب وہ بُت کافر بھی مرا دل رکھ لے
"پاسباں ملتے ہیں کعبہ کو صنم خانے سے"
شمسؔ کو دیکھ کے سکھیوں سے یہ کہنا اُن کا
یہ تو کچھ، ہم کو نظر آتے ہیں دیوانے سے

(۹۳)

احساس آمدِ عہدِ شباب ہے
آنکھوں میں جھیپ ہے، تو ادا میں حجاب ہے،
اس عہد میں تو حسن بتاں بے نقاب ہے
اللہ! اب بھی آپ کو ہم سے حجاب ہے؟

مانا کہ ایک خواب یہ عمرِ خراب ہے
کیا خواب ہی خیال عذاب و ثواب ہے؟

حور و طہور کی ہے تمنّا جناب شیخ!
پھر شاہد و شراب سے کیوں اجتناب ہے؟

واعظ! نظر کو اور ذرا تو بلند کر
کیا لغو گفتگوئے عذاب و ثواب ہے!

اہلِ نظر نہیں ہیں قیامت کے منتظر
ہر روز زندگی میں حساب و کتاب ہے

جنّت کی نعمتوں کا تصوّر ہے رات دن
زاہد بھی مبتلائے شراب و کباب ہے

کیا پوچھتے ہو شمس منیری کی سرخوشی؟
حُسنِ بُتاں سے ذوقِ نظر کامیاب ہے

﴿۹۴﴾

تہ چل او دستِ جامِ کامرانی اِس قدر تن کے
بہت دیکھی ہیں تقدیریں بگڑتی ہم نے بن بن کے

مزا ہے آپ روٹھیں اور منائیں منتوں سے ہم
قیامت ہے مگر پھر روٹھ جانا آپ کا من کے

چمن میں لالہ و گل کی یہ رنگینی کہاں ہوتی!
یہ پرزے ہیں کسی خوں گشتہ دل کے جیب و دامن کے

وہ اس بُت کا رُخِ گل رنگ، اور وہ نیلگوں آنکھیں!
تماشا، تختۂ گُل میں کھلے ہیں پھول سوسن کے

حیا سے تم جھکے جاتے ہو، یہ بھی کوئی مِلنا ہے
جو ملنا ہے تو سینے سے لپٹ جاؤ ذرا تن کے

ذرا مشکل سے اُٹھے گا جنابِ شیخ کا لاشہ
یہ برکت دعوتوں کی ہے کہ حضرت ہیں کئی من کے
کوئی چھینٹا پڑے تو شمسؔ جنگل کو نکل جائیں
مثالِ داغؔ ہم بھی منتظر بیٹھے ہیں ساون کے

(۹۵)

نہ قسمت کی شکایت ہے نہ ان کی چشم پرفن کی
مجھے عادت سی ہے فریاد کی نالے کی شیون کی
نگاہِ شوق اُن کے در پہ جا کر کس سے اُلجھے گی؟
سنا ہے وہ اُٹھانے والے ہیں اب رسم چلمن کی
وہ ہو پازیب کی جھنکار یا چاندی کے سکوں کی
عجب تقویٰ شکن آواز ہوتی ہے جھناجھن کی

زکوٰۃ حسن دے، میں مستحق ہوں ایک مدّت سے
فقیروں کی دعا لے لو، الٰہی خیر ہو جوبن کی!

چمن کو دیکھتے ہیں اہلِ عبرت اس طرح، دیکھو!
کھُلی ہے آنکھ نرگس کی، زباں ہے بند سوسن کی

دیا ہے تمسؔ نے دل اس بُتِ نوخیز کو جس میں
بہاریں ہیں جوانی کی، ادائیں ہیں لڑکپن کی

——— ﴿۹۶﴾ ———

آجا بہارِ حسن کا جلوا لئے ہوئے
بیٹھا ہوں کب سے دیدۂ بینا لئے ہوئے

آجا شبِ وصال کا تقاضا لئے ہوئے
آجا نیاز و ناز کا جھگڑا لئے ہوئے

ﻟﮧ تو صاحب نعمتی من مستحقم زکوٰۃ حسن دہ حقدارم اسٹپ (حافظ)

دل میں ہزار لطفِ مدارا لئے ہوئے

لب پہ ہزار شکوۂ بیجا لئے ہوئے

میں اور آرزو کا تقاضا لئے ہوئے

تو اور نازکی کا بہانا لئے ہوئے

تو اور تیرے ساتھ ہزاروں شریکِ بزم

میں اور دردِ عشق کو تنہا لئے ہوئے

زندانیوں کا عیشِ خیالی نہ پوچھئے

ہے ہر خیال وسعتِ صحرا لئے ہوئے

ملتا نہیں ہے نشترِ مژگاں کسی کے پاس

پھرتا ہوں ایک سینہ میں پھوڑا لئے ہوئے

ملکِ عدم سے رنج و غم و درد و سوز کو

آیا ہوں اپنے ساتھ اکٹھا لئے ہوئے

رفتارِ آسماں کی شکایت فضول ہے
پھرتا ہے وہ بھی ساغر و مینا لیے ہوئے
سینے میں دل کہاں وہ حسینوں میں بٹ گیا
بیٹھا ہوں اک بچا ہوا ٹکڑا لیے ہوئے
اے شمسؔ دَوڑ دھوپ کا کچھ فائدہ نہیں
بیٹھا بھی رہ نصیب کا ٹکڑا لیے ہوئے

۹۷

وہ شے جو جامِ مے میں تہ نشیں معلوم ہوتی ہے
خدا معلوم! کیوں اتنی حسیں معلوم ہوتی ہے
ہے زلفِ برہم، خیر یا رب میری کشتی کی!
رُخِ دریا پہ بھی چیں بجبیں معلوم ہوتی ہے

الٰہی، نجد میں تخمِ محبت کس نے بویا تھا؟
بڑی دلکش یہاں کی سرزمیں معلوم ہوتی ہے

نگاہِ ناز کے ہاتھوں میں خنجر دیدیا کس نے؟
عجب سفاک چشمِ سرمگیں معلوم ہوتی ہے

نہیں بے وجہ صورت سے تعلق اہلِ معنی کو
یہی تصویر صورت آفریں معلوم ہوتی ہے

نہیں آتا یقیں دل کو تمہاری بات پر لیکن
تمہاری بات پھر بھی دل نشیں معلوم ہوتی ہے

مئے فردوس کیا ہے یہ تو تُو جانے مگر زاہد!
مئے انگور کی وہ خوشہ چیں معلوم ہوتی ہے

چلے جاتے ہیں سب نقل مکاں کرکے قبروں میں
بڑی بستی کوئی زیرِ زمیں معلوم ہوتی ہے

جسے تو تلخ وش کہتا ہے بے چکھے ہوئے واعظ!
وہ بزمِ صوفیہ میں انگبیں معلوم ہوتی ہے

یہ محفل میں غزل خواں کون ہے؟ شمسِ منیری ہے؟
اسی کی یہ تو آوازِ حزیں معلوم ہوتی ہے

(۹۸)

جھکی ہے آستانِ دیر پر یارب جبیں اپنی
حرم کی راہ میں منزل نہ بن جائے کہیں اپنی

چمن میں آہ! سوسن کی زباں کا شکوہ کیا کیجئے
کہ دکھلاتی ہے نرگس اب تو چشمِ خشمگیں اپنی

کسی[1] کو کیوں گراں ہو گریۂ بے اختیار اپنا
دل اپنا، اپنی آنکھیں، اپنے آنسو آستیں اپنی

[1] نمی دانم ز منعِ گریہ مطلب چیست ناصح را؟ دل از من دیدہ از من، آستین از من، کنار از من

مجاور کر رہے ہیں آپ ہی سودا مزاروں کا

لحد کی خاک باقی تھی سو وہ بھی اب نہیں اپنی

یہ گھٹے ہیں خدا معلوم کن کن آستانوں کے!

دکھاتا پھر رہا ہے شیخ محشر میں جبیں اپنی

نہ آئی اس میں زرخیزی کوئی خونِ شہیداں سے

خدا معلوم! کیوں اتنی ہوئی بنجر زمیں اپنی

درِ رحمت ابھی تک وا نہیں ہوتا قیامت سے!

عبث جا جا کے ٹکراتی ہے فریادِ حزیں اپنی

وہ زخمی دل ہوں سُننے کی بھی اب طاقت نہیں مجھ میں

نہ کہہ روداد بربادی خدارا ہم نشیں اپنی

ہمیں بھی انتظارِ عہدِ نوشمس منیری تھا

مگر مایوس ہی لوٹی نگاہِ واپسیں اپنی

لہ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود (قرآن شریف)

﴾۹۹﴿

ہونٹوں میں تبسّم کلیوں کا، گالوں میں لالی پھولوں کی
کچھ پھول اِدھر بھی دیتی جا' او بیچنے والی پھولوں کی !

اُف ! باغِ حسن میں اس بُت کے کیا کیا ہیں بہاریں کیا کہیے'
تن میں ہریالی سبزے کی' گالوں میں لالی پھولوں کی

پھاگن کی ہوائیں چلتی ہیں، شاخوں میں کلیاں کھلتی ہیں
اس فصل میں جوبن دکھلاتی ہے ڈالی ڈالی پھولوں کی

گلزارِ محبت میں مَیں بھی' اک روز کہیں جا نکلا تھا
سبزی تھی انوکھی پیڑوں کی' خوشبو تھی نرالی پھولوں کی

اک وقت یہ ہے گلشن کی ہوا' اب زہری لگتی ہے ہم کو
اک وقت وہ تھا جب کرتے تھے، ہم دیکھا بھالی پھولوں کی

گلچیں نے چُن چُن کر توڑے، یاروں نے ہار بنا ڈالے
اے مالی تجھ سے ہو نہ سکی کچھ بھی رکھوالی پھولوں کی
کنجوں کے اندھیرے میں روشن پھولوں کے دیئے کر ڈالے ہیں
باغوں میں ساقیِ فطرت نے کیا خوب بھی ڈالی پھولوں کی
کچھ داغ جگر ہیں پہلو میں، کچھ داغ اشک ہیں دامن میں
اے شمسؔ لگائی ہم نے بھی کیا خوب یہ ڈالی پھولوں کی!

۱۰۰

یہ نہ کہیئے رنگ و بو کا لطف گلزاروں میں ہے
گل سے بڑھ کر زلف میں بو، رنگ رخساروں میں ہے
گرچہ مفلس ہوں، مگر وہ یوسف مصر جمال
جانتا ہے مجھ کو یہ میرے خریداروں میں ہے

یہ لبِ شیریں ترے، یہ ترشیٔ گفتار آہ!
چاشنی کیسی غضب کی ان شکر پاروں میں ہے!

یوں تو شغلِ مے سے کر لیتے ہیں ہم بھی غم غلط
بے پیے جو مست رہتا ہو وہ ہشیاروں میں ہے

بلبلِ ناشاد! اُچک لے پھول اس کے ہاتھ سے
دامنِ گلچیں ابھی اُلجھا ہوا خاروں میں ہے

عفو کا اعلان ہوا ہے مجرموں کی ہے تلاش
شمسؔ کی قسمت تو دیکھو وہ گنہگاروں میں ہے

---(۱۰۱)---

مذاقِ سیر میرا مدعائے دل نہ بن جائے
یہی منزل سفر کی آخری منزل نہ بن جائے

رہِ وحشت میں سنگِ راہ میرا دل نہ بن جائے
مرا ناخن ہی میرا عقدۂ مشکل نہ بن جائے

مرے سینے میں ہے اک داغ، پھر وہ دل نہ بن جائے
مرا ماضی الٰہی! میرا مستقبل نہ بن جائے

کہیں صحرا میں مجنوں کی طرح میں بھی نہ بس جاؤں!
کہیں رستا ہی میرے واسطے منزل نہ بن جائے!

مرے تن من کو پھونکے ڈالتی ہے دل کی چنگاری
یہ میری مشت خاکستر مرا حاصل نہ بن جائے

نہ رہ جائے اسی پتھر پہ ٹک کر میری پیشانی
تمہارا آستاں سنگِ سرِ منزل نہ بن جائے

کہیں ایسا نہ ہو طوفاں میں کھینا چھوڑ بیٹھوں میں!
مری کشتی کہیں منجدھار میں ساحل نہ بن جائے

اسی سے ہو نہ جائے فوت جو ہے مقصد اصلی
سکونِ دل کی کوشش اضطرابِ لا بن جائے
چلو، اچھی نہیں ہی اہل دل کی اتنی ناقدری
کہیں شمس منیری لے بتو ابیدلی نہ بن جائے!

۱۰۲

اُٹھی جو نقاب رُخِ گل بادِ صبا نے
گھبرا گئی بلبل، نہ رہے ہوش ٹھکانے
وہ تازگیِ رنگ، وہ شادابیِ رخسار
مشاطہ گری کی تھی عجب نشو و نما نے
موسیٰ کی طرح دیکھتے ہی غش اسے آیا
وہ جلوہ دکھایا رخِ دلبر کی ضیا نے

بے ہوش جو دیکھا، تو حسینان گلستاں

بلبل کو لگے لخلخہ و عطر سنگھانے

تدبیر کوئی کام نہ آئی مگر اس وقت

کچھ فائدہ بخشا نہ عزیزوں کی دوانے

یہ دیکھ کے گُل بلبل بیہوش کے مُنہ پر

جُھک جُھک کے لگا دامنِ رنگین کو ہلانے

گو بلبل بیدم میں نہ تھی جان بھی باقی

پھر زندہ کیا دامنِ دلبر کی ہوا نے

آنکھوں کو جو کھولا تو یہ منظر نظر آیا

ہے چارہ گری میں کوئی مصروف سرہانے

اس تازہ عنایت نے کیا اور بھی مدہوش

سب ہوش و خرد چھین لئے گل کی وفا نے

اب بلبل بدمست کا ہے اور ہی عالم
آنکھوں میں نشہ، سر میں جنوں، لب پہ ترانے
ہم کہہ گئے اے شمسؔ مگر کوئی نہ سمجھا
ہیں اپنے ہی قصے گل و بلبل کے فسانے

۱۰۳

شمسؔ پٹنے کی طرف اپنی سواری پھر چلی
لے کے مجھ کو میرے دل کی بے قراری پھر چلی
محوِ لیلیٰ ہو کے مجنوں آپ لیلیٰ بن گیا
جانبِ صحرائے نجد اس کی عماری پھر چلی
میری قسمت مدتوں سے پھر رہی تھی نامراد
اب دلہن بننے کو یہ قسمت کی ماری پھر چلی

کس کی تیغِ ناز کا اب تک مزا بھولا نہیں؟
جانِ بسمل کھا کے ایسا زخم کاری پھر چلی

طبعِ مضطر کا اسی قاتل کی جانب رُخ ہی پھر
لو! اسی کوچے میں یہ حق کی سواری پھر چلی

پھر چلا اس بت کے قدموں کی طرف ذوقِ سجود
رت جگے کو عادتِ شب زندہ داری پھر چلی

پھر چلا میں اس کی بزمِ ناز میں ستانہ وار
پھر چلی اس باغ میں بادِ بہاری پھر چلی

شوق، حسرت، آرزو، ارمان، اُمید، آسرا
ساتھ میرے بھیڑ یہ ساری کی ساری پھر چلی

یہ بہارِ عیش، یہ جاڑوں کی راتیں، ہائے ہائے!
شمسؔ گھر چل، ورنہ یہ فصلِ بہاری پھر چلی

۱۰۴

گھنگھور گھٹا پھر چھائی ہے پھر یاد تمہاری آتی ہے
بے چین طبیعت ہے میری تنہائی سے گھبراتی ہے
تم آؤ تو آؤ جلدی سے، یا مجھ کو بلاؤ جلدی سے
یہ کالی رات گھٹا چھائی فرقت میں کاٹے کھاتی ہے
کیا تجھ کو بتاؤں اے ظالم کیا وحشت دل کو ہوتی ہے!
جب مور کوئی چلاتا ہے یا کوئل شور مچاتی ہے
سُن سُن کے پپیہے کا نعرہ بس مُنہ کو کلیجہ آتا ہے
پی، پی، کی صدا جب آتی ہے تو دل پہ چھری چل جاتی ہے
اے شمس سنبھال اپنے دل کو، ایسی بھی بھلا بے صبری کیا
اب کوئی گھڑی میں اس بت کے آنے کی خبر بھی آتی ہے

(۱۰۵)

اَپنے بیگانے ہوئے اے جانِ جاں تیرے لیۓ
بن گۓ دشمن زمین و آسماں تیرے لیۓ

سَاتھیوں نے سَاتھ چھوڑا دوستوں نے دوستی
ہو گۓ اپنے پراۓ بدگماں تیرے لیۓ

کیسے ہم بے فکر تھے جب تک نہ تھا تیرا خیال
ایک آفت ہم پہ آئی ناگہاں تیرے لیۓ

اِک زمانہ وہ بھی تھا جب چہچہے دِن رات تھے
اب ہیں ہم اور روز و شب آہ و فغاں تیرے لیۓ

لالہ و گل، سرو و شمشاد اب بھی ہیں گلزار میں
سب کو چھوڑا ہم نے اے سروِ رواں تیرے لیۓ

اک طرف صیّاد دشمن اک طرف گلچیں خفا

اِک طرف بگڑا ہے ہم سے باغباں تیرے لیے

ہم نے تیرے واسطے کیا کیا اُٹھائیں مشکلیں!

ہم نے جھیلے کیسے کیسے امتحاں تیرے لیے!

سختیاں ساری سہیں تیرے لئے اے دل رُبا

کھوئے سب آرام اے آرامِ جاں تیرے لیے

یاد ہے اب بھی جو ہم میں تجھ میں تھا قول و قرار؟

تو ہمارے واسطے ہم جانِ جاں تیرے لیے

وعدۂ وصل آج تک ظالم نہ پورا ہو سکا

مُفت کی ہم نے جوانی رائگاں تیرے لیے

جان تک اس نے لگا دی چاہ کی بازی میں آہ

کچھ نہ دیکھا شمسؔ نے سود و زیاں تیرے لیے

(۱۰۶)

مژدۂ فصلِ بہاری پھر صبا لانے کو تھی
پھر وہ اک ہلکی سی شورش اُن کے دیوانے کو تھی

باغ میں ہر شئے پہ تھا اک کیف سا چھایا ہوا
کھل چلے تھے پھول کلیوں کو ہنسی آنے کو تھی

آچلا تھا نرگس ساقی کا صحت پر مزاج
پھر ریاضِ حسن میں فصلِ بہار آنے کو تھی

ناگہاں جھلسا گئی اس باغ کو بادِ سموم
کیا خبر تھی اک بلائے ناگہاں آنے کو تھی

آہ! یوں بے وقت باغِ آرزو لٹنے کو تھا
عندلیبِ زار کی قسمت بگڑ جانے کو تھی

کس طرح دل کو یقیں آئے کہ وہ تصویر حسن
آہ! یوں حرفِ غلط کی طرح مٹ جانے کو تھی

کس طرح دل کو یقیں آئے کہ وہ تمثالِ ناز
خاک میں اس بے کسی کے ساتھ مل جانے کو تھی

کھل گیا مجھ پہ طلسمِ رازِ مرگ و زندگی
شمسؔ! یہ ٹھوکر غضب کی میرے چونکانے کو تھی

۱۰۷

تسلیم کی خو ڈالی تھی، مگر کیا کہیے کیوں چپ رہ نہ سکے
جب ظلم بتاں گزرا حد سے، اللہ کے بندے سہہ نہ سکے
آگے سے منہ کو موڑ لیا، پیچھے کی طرف کو دوڑ پڑے
الٹی گنگا تو بہا لی تھی اس دھارے میں سب بہہ نہ سکے

کہنے کی بہت سی باتیں تھیں، سُننے کی بہت سی باتیں تھیں
افسوس! کہ وہ کچھ سُن نہ سکے، افسوس! کہ ہم کچھ کہہ نہ سکے

گلشن پہ اُداسی چھائی ہے۔ اک خاک سی ہر سُو اڑتی ہے
اس باغ کی حالت کیا ہوگی، جس باغ میں بلبل رہ نہ سکے

قسمت سے ملا تھا جو کچھ بھی، وہ دودھ نہیں مٹھا ہی سہی
اس چھاچھ سے بھی مکھن ملتا، افسوس کہ گھوسی مہ نہ سکے

اَے شمسؔ خموشی بہتر ہے، اس شخص کی حالت کیا کہیئے
جس شخص کا دل ہو درد بھرا لیکن وہ زباں سے کہہ نہ سکے

۱۰۸

نومشق نازہے نگہ سحر فن ابھی
سفاک اور ہوگا وہ ناوک فگن ابھی

کم کم کھلا ہے لالۂ خونیں کفن ابھی
پوری بہار پہ نہیں آیا چمن ابھی

آئندہ گل کھلاتی ہے کیا کیا یہ دیکھئے!
سینچی گئی ہے خوں سے زمینِ چمن ابھی

جو آگ آشیانۂ بلبل جلا گئی
ہوتی ہے سارے باغ میں وہ شعلہ زن ابھی

دیکھوگے سوزِ نالۂ بلبل کا بھی اثر
آتش کدہ بنے گا یہ صحنِ چمن ابھی

گلچیں کا باغباں سے تعلق نہ پوچھئے
یاں رہ نما کے بھیس میں ہے راہزن ابھی

صبحِ وطن میں شامِ غریباں نہیں کی ہے
اپنے وطن میں رہ کے جو ہیں بے وطن ابھی۔

فصل خزاں و موسم گل پر نہ جائیے
بدلے گا اور رنگ سے رنگ چمن ابھی

یہ بستیوں کے کارواں ہوں گی جوئے شیر
مزدور نامراد ہے گو کوہ کن ابھی

مسند ملے گی منزل لیلی کی پھر اسے
گو قیس دشت نجد میں ہے بے وطن ابھی

ہے سوز و ساز محفل انجم بس ایک شب
ہوتی ہے صبح، اٹھتی ہے یہ انجمن ابھی

وقت طلوع شمس ہے اب دیر کچھ نہیں
ہے مشرق بعید پہ وہ ضو فگن ابھی

اے شمس اہل بزم ہیں سن سن کے دم بخود
ان کے لئے نئی ہے یہ طرز سخن ابھی

۱۰۹

خزاں کے دن گزر گئے، بہار کی ہوا چلی
نکھر گیا شجر شجر، سنور گئی کلی کلی
ستارے جھلملا رہے ہیں، چاند ماند پڑ گیا
اُٹھو اُٹھو! ہوئی سحر، گجر بجا ہوا چلی
لئے ہے جام آفتاب دستِ رعشہ دار میں
یہ کاش کوئی پوچھتا کہ رات بھر کہاں ڈھلی
یہ وقت دورِ جام ہے یہاں کسے قیام ہے
یہ فرصت اب تمام ہے، لگی ہی بس چلا چلی
ہے باغباں کو ساز باز رہزنانِ باغ سے
تو ساکنانِ باغ میں مچی ہوئی ہے کھلبلی

کچھ اس طرح کی سمیت ہے اب ہوائے باغ میں
کہ چشمِ لالہ میں ہے خوں، زباں گل بہک چلی
وہی کہ جن کی ہر ادا میں اک وقار خاص تھا
وہی سُنا رہے ہیں اب بہم دگر کٹی جلی
یہی ہیں خامکاریاں، یہی ہیں بدلگامیاں
تو دیکھئے گا ایک دن رنگی ہوئی گلی گلی
خدا سے ہیں بغاوتیں، بتوں کی ہیں رعایتیں
تو اس کی کیا شکایتیں، خدا نے کچھ خبر نہ لی
بہار آئے پھر یہاں، کہیں یہ اہلِ گلستاں
"نکھر گیا شجر شجر، سنور گئی کلی کلی"
یہی دعا ہے شمس کی کہ شانتی ہو ملک میں
خدا کرے کہ ہم کہیں، وہ دن گئے بلا ٹلی

(۱۱۰)

یار سے دو بدو، نظر نہ ہوئی
لاکھ چاہا کہ ہو، مگر نہ ہوئی

لکھنے بیٹھے جو داستانِ شوق
مختصر پر بھی مختصر نہ ہوئی

جس میں ہوتا نہ کوئی لمحۂ رنج
ایسی راحت تو عمر بھر نہ ہوئی

شب فرقت گزر ہی جائے گی
کون سی شب ہے، جو سحر نہ ہوئی؟

رہنما راہزن بنے سارے
اپنی قسمت جو راہبر نہ ہوئی

اشک غم پی گئے ہم ان کے حضور
یہ شہادت بھی معتبر نہ ہوئی

کبھی عریاں وہ اس میں ہو جاتے
چشمۂ آب چشم تر نہ ہوئی

جانتے ہم کہ زندگی یہ ہے
زندگی اس طرح بسر نہ ہوئی

وہ طلب کیا؟ جو در پہ ٹھہر گئی
وہ نظر کیا؟ جو پردہ در نہ ہوئی

تلخیٔ مرگ میں تھا آب حیات
وائے قسمت! ہمیں خبر نہ ہوئی

اب لنگوٹی پہ پھاگ کھیلیں گے — روکھی سوکھی میں جب گزر نہ ہوئی

گرچہ تھا مقتضائے وقت یہی — زندگی مثلِ کورو کر نہ ہوئی

ولئے وہ وعدہ جس کے تیور سے — "آتشِ شوق تیز تر" نہ ہوئی

شربتِ وصل کا مِلا اک گھونٹ — ہوئی تسکین، پیاس بھر نہ ہوئی

چاندنی کھل رہی ہے صحرا میں
شمسؔ وحشی کو کیا خبر نہ ہوئی؟

(۱۱۱)

گلستاں سے شورِ فغاں اُٹھ رہا ہے
عنادل کا اب کارواں اُٹھ رہا ہے
یہ ہے انقلاب، اک جہاں اُٹھ رہا ہے
زمیں اُٹھ رہی ہے زماں اُٹھ رہا ہے

ذرا اس کو سوچیں تو اہلِ تفکّر

یہ ہنگامہ کیا ناگہاں اُٹھ رہا ہے

غریبوں کو دانا میسّر نہیں ہے

امیروں کا ہر جا مکاں اُٹھ رہا ہے

کسی کو نہیں جھونپڑی تک کا سایہ

کسی کے لئے سائباں اُٹھ رہا ہے

ابھی اور کچھ ہنس لیں ضحاک شیوہ

بس اب پرچم کاویاں اُٹھ رہا ہے

جلی ہو نہ اس میں مرے دل کی حسرت

یہ کس کی چتا سے دھواں اُٹھ رہا ہے؟

نہیں کچھ یہاں قدر نقد وفا کی

یہ گنج گراں رائگاں اُٹھ رہا ہے۔

مذاق سخن کی کمی کا گلہ کیا !
کہ تہذیب کا ہر نشاں اُٹھ رہا ہے

وہ وعدہ کریں بھی تو کیا اس سے حاصل؟
کہ اب اعتبارِ زباں اُٹھ رہا ہے

نگاہوں میں آتی ہیں کچھ جھلکیاں سی
وہ پردہ جو تھا درمیاں اُٹھ رہا ہے

نیا خون پھر دوڑتا ہے رگوں میں
جمودِ مہِ مہرگاں اُٹھ رہا ہے

ہیں آثار موسم کے اب اور ہی کچھ
بہت جلد دورِ خزاں اُٹھ رہا ہے

غنیمت تھی شمس منیری کی ہستی
زمانے[1] کا اک رازداں اُٹھ رہا ہے

[1] سرآمد روزگار ایں فقیرے ۔ دگر دانائے راز آید کہ ناید (اقبال)

گل و سوسن

گر سر بہ صحبت گل و سوسن درآورم
دستِ چمن گرفتہ بمسکن درآورم

(عرفی)

(۱)

ہمارا ہندستان

ہندستان ہمارا ہے ــــ دل سے ہم کو پیارا ہے

پیارا اپنا ہندستان

پیارا اپنا کوہستان

پیارا اپنا ریگستان

پیارا اپنا نخلستان

پیارا اپنا ہندستان

ہندستان ہمارا ہے ــــ دل سے ہم کو پیارا ہے

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی

سارے ہندستانی بھائی

سب کی ایک اچھائی بُرائی
ایک حکومت، ایک خدائی
ایک ترانہ، اک شہنائی
ہندستان ہمارا ہے دل سے ہم کو پیارا ہے

اپنا جھنڈا ہندستانی
قومی آزادی کی نشانی
اس سے دل میں جوش جوانی
اِس سے دشمن پانی پانی
اس کے نیچے ہندستانی
ہیں آمادۂ ہر قربانی
ہندستان ہمارا ہے دل سے ہم کو پیارا ہے
اپنے دیس کی شان یہی ہے

اپنی قوم کی جان یہی ہے
ملّت کی پہچان یہی ہے
دین یہی، ایمان یہی ہے
وید یہی، قرآن یہی ہے
ہندستان ہمارا ہے دل سے ہم کو پیارا ہے

(۲)

فخرِ وطن

کاش! اپنا یہ وطن فخر کے قابل ہوتا
کاش! اس کا نہ کوئی مدِّمقابل ہوتا
کاش! دریائے محبّت کا یہ ساحل ہوتا
کاش! آزادیٔ جمہور کی منزل ہوتا

کاش! ہر فرقہ یہاں خرم و خوش دل ہوتا
کاش! اپنا یہ وطن فخر کے قابل ہوتا

ہر قوی کو یہاں کمزور پہ شفقت ہوتی
ہر بڑے کو یہاں چھوٹے سے محبت ہوتی
دین اور دھرم میں باہم نہ عداوت ہوتی
چھوت چھات اور نہ ذاتوں کی یہ لعنت ہوتی
اکثریت کو نہ اس درجہ رعونت ہوتی
کاش! اپنا یہ وطن فخر کے قابل ہوتا

کاش! ہوتا نہ یہاں خرد و کلاں کا جھگڑا
بھائی بھائی میں زمیں اور مکاں کا جھگڑا
مسجد و مندر و ناقوس و اذاں کا جھگڑا
فرقے فرقے میں لباس اور نشاں کا جھگڑا

ملک کے ملک میں تہذیب و زباں کا جھگڑا

کاش ! اپنا یہ وطن فخر کے قابل ہوتا

ملک میں ہوتی نہ افلاس کی حالت ایسی

نہ یہاں قلت احساس کی حالت ایسی

نہ یہ ناداریٔ احساس کی حالت ایسی

نہ زبوں عامۃ الناس کی حالت ایسی

قحط و امراض سے اُف ! یاس کی حالت ایسی

کاش ! اپنا یہ وطن فخر کے قابل ہوتا

ہوتی محصول کی اس درجہ نہ بھرمار یہاں

اس طرح ہوتے پریشاں نہ تجار یہاں

مطمئن ہوتے کسان اور زمیندار یہاں

قلی مزدور نہ ہوتے کبھی بیکار یہاں

ہوتی سرمایہ و محنت میں نہ پیکار یہاں

کاش ! اپنا یہ وطن فخر کے قابل ہوتا

چور بازاری کی ہوتی نہ تجارت اس میں

ہوتی رونق پہ ہر اک صنعت و حرفت اس میں

چلتی دفتر میں نہ ہر گام پہ رشوت اس میں

ہوتے حکام سبھی اہل دیانت اس میں

سُنتی مظلوموں کی فریاد عدالت اس میں

کاش ! اپنا یہ وطن فخر کے قابل ہوتا

دُور اس ملک سے ہر رسم جہالت ہوتی

دُور اس ملک سے ہر طرح کی وحشت ہوتی

بربریت کے بجائے مدنیت ہوتی

صرف حیواں کی نہ بے وجہ حمایت ہوتی

خونِ انساں کی بھی اس دیس میں حرمت ہوتی

کاش! اپنا یہ وطن فخر کے قابل ہوتا

ملتی اس ملک میں آزادی کی نعمت سب کو

مختلف طرزِ تمدّن کی اجازت سب کو

ہوتی ہر فرقہ کی ملحوظ رعایت سب کو

خویش و بیگانہ سے یاں ہوتی مروت سب کو

حسنِ اخلاق و مراعات کی عادت سب کو

کاش! اپنا یہ وطن فخر کے قابل ہوتا

مختلف فرقوں سے اُٹھ جاتا وہ نفرت کا اثر

پھر نہ آتا کوئی بھارت میں نظر تنگ نظر

متحد ہوتے جو سب فرقے یہاں باہم دیگر

ملتے ایک ایک سے سب بھائی چچا کہہ کر

پھر وہ پہلے کی طرح ہوتے سبھی شیر و شکر
کاش! اپنا یہ وطن فخر کے قابل ہوتا

۳

ترانۂ اُردو

سب بولیوں سے اچھی اُردو زباں ہماری
یہ مادری زباں ہے اے مہرباں ہماری
اس بحر میں ملے ہیں آ آکے سارے دریا
ہے بولیوں کا سنگم اُردو زباں ہماری
دشمن ہیں ملک کے وہ جو فرق ڈالتے ہیں
ہندی وہی ہے جو ہے اُردو زباں ہماری
سینچا ہے اس کو ہم نے اپنے لہو سے صدیوں
برباد کر نہ کھیتی اے باغباں ہماری

یہ اتحاد ملک و ملت کی ہے نشانی

تہذیب ہو نہ جائے پھر بے نشاں ہماری

چڑھتے ہیں اس سے علم و فن کی بلندیوں پر

بامِ عروج کی ہے یہ نردباں ہماری

پھیلی ہوئی ہے چین و مصر و عراق تک یہ

قومیں جہاں کی اس سے ہیں ہم زباں ہماری

لیتے ہیں لطف اس کے شعر و ادب سے اکثر

کرتے ہیں اس سے عزت اہلِ جہاں ہماری

اس ملک میں ہیں یک دل ہم یک زباں ہو کر

شیرازہ قوم کا ہے اردو زباں ہماری

اپنی حیات مضمر ہے اس کی زندگی میں

"ہم اس کے پاسباں ہیں، یہ پاسباں ہماری"

یہ ثمس کا ترانہ تاریخ قوم کی ہے
ہر لفظ میں ہے اس کے اک داستاں ہماری

۴

قیدِ مشقّت

اغیار کی خدمت سے مل جائے گر آزادی
سمجھوں گا مجھے حق نے اک نعمت عظمیٰ دی

ذلّت کا بھی اب ہم کو احساس نہیں مطلق
افسوس! غلامی کے ہم ہو گئے کیا عادی

اس عہد کے سب نوکر بد تر ہیں غلاموں سے
گو زعم میں ان کے ہے حاصل انہیں آزادی

جب عمر ہوئی پچپن کی تب اس سے ہو چھٹکارا
یہ قیدِ مشقّت بھی گویا کہ ہے میعادی

میعاد مگر اتنی لمبی ہے کہ پہلے ہی
شاید قفس تن سے ہو رُوح کو آزادی

آغاز میں خوش آئند، انجام میں بے حاصل
حاصل ہوئی ہے کس کو یہ جنّت شدادی!

حکّام کو لوگوں نے سمجھا ہے کفیل رزق
یاں نوکری گر چھوٹی بس آ گئی بربادی

اخلاق ہوئے ہیں مسخ، معلوم نہیں ہم کو
کیا چیز ہے خودداری، کیا چیز ہے آزادی

سب نوکریاں یکساں ہیں شان غلامی میں
ہو خدمت دربانی یا منصب استادی

اس سے ہے کہیں بہتر معماری و مزدوری
اس سے ہے کہیں افضل نجاری و حدادی

پر زن بہ ہوا بر خیز، با برق و سحاب آویز
اے شمس تو شاہینی، بر خاک چہ افتادی

۵

آوازِ سروش

آ رہی ہے عالمِ بالا سے آوازِ سروش
"اے ز فرصت بیخبر در ہر چہ کوشی زود کوش"

جم رہی ہے مُلک میں کِس ٹھاٹھ سے بزمِ طرب!
کوئی ہے ساغر بدست اور کوئی ہے مینا بدوش

مبتلائے پردۂ سیمیں ہیں سارے نوجواں
رونقِ محفل ہے ہر جا شاہدِ عصمت فروش

کم نہیں ہیں بزمِ پیری کی بھی کچھ رنگینیاں
اپنا حلقہ باندھ کر بیٹھا ہے پیرِ خرقہ پوش

لمبی لمبی داڑھیوں پر شیخ و ملا کی نہ جا

کوئی اُن میں خود فروش اور کوئی ہے ایماں فروش

آستانِ غیر پر ان کی جبینیں ہیں جھکی

ظاہراً جبہ عمامہ، باطناً زنّار پوش

ملک میں مضبوط ہے سرمایہ داری کا نظام

اہلِ دولت رنگ محلوں میں ہیں گرمِ نا و نوش

مثلِ سابق حالتِ مزدور ہے اب تک سقیم

وہ بچارا ہی ابھی تک سخت کوش و دلق پوش

ہیں کسان اپنی غذا کے واسطے محتاجِ غیر

اور زمینداروں کے گھر میں صرف جو کا آبجوش

چور بازاری، ڈکیتی، غبن، رشوت، پیروی

ان ہی چیزوں کے لئے گویا ہے کھدر ستر پوش

مخرب اخلاق ہے طبعاً یہاں کی سرزمیں
ملک کے اکثر سیہ رو بن گئے ہیں سرخ پوش

پیٹ اپنا بھرتے ہیں بھوکوں کو بھڑکاتے ہیں یہ
ان کا مذہب زن پرستی ان کا مشرب ناؤ نوش

حال یاراں کی نظر ہے اور آگے کچھ نہیں
ان کی تقویم نوی ہے خالی از فردا و دوش

ملک میں ہنگامہ ہے آتا ہے وقت انتخاب
دیش کے سیوک اٹھے ہیں دیدنی ہے ان کا جوش

ایک دو کا ذکر کیا آوے کا آوا ہے خراب
برہمن انسانیت کش مولوی ملت فروش

اس چمن میں بلبل ناشاد کا مت پوچھ حال
سازش صیاد و گلچیں سے ہے وہ خانہ بدوش

زاغ کرتا پھر رہا ہے ہر طرف کو کائیں کائیں
اور مرغ خوش نوا، قمس میری، ہے خموش

۶
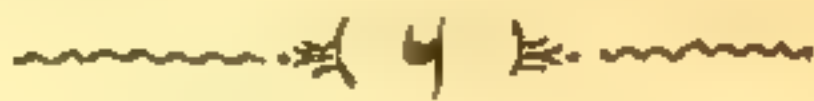
ہولی

ہے اَبکے سال بڑی دھوم دھام ہولی میں
نئی فضا ہے، نیا اہتمام ہولی میں
پلا کے میں نے محبّت کا جام ہولی میں
کیا ہے اس بت بد خو کو رام ہولی میں
گلال کی بھی ضرورت نہیں کہ مے پی کر
بنے ہیں سارے حسین لالہ فام ہولی میں
نہ کیوں ہوں نعل در آتش جو رند ہیں ساقی!
کہ آج تو بھی ہے آتش بجام ہولی میں

ملا ہے صبح[۱] پہ شفق کا عبیر سورج نے
عجیب بہار کی ہیں صبح و شام ہولی میں

غریب امیر سبھی مل کے عیش کرتے ہیں
ہے ایک سطح پہ سب کا مقام ہولی میں

یہ مست اپنے محل میں، وہ اپنی کٹیا میں
نہیں ہے کوئی کسی کا غلام ہولی میں

تُلا رہے ہیں رتّولی[۲] میں حضرت جاوید[۳]
قیام کا ہے وہی تو مقام ہولی میں

عجب نہیں کہ ملے کوئی آہوئے وحشی
کہ ہے شکار کا بھی انتظام ہولی میں

---

۱ صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم (عرفی)
۲ قصبہ جولی شریف، ضلع گیا، مشہور شکار گاہ ۳ جناب عبدالحی خاں صاحب ایس۔ڈی۔او نواڈہ (بعد میں کلکٹر)

یہ دے دیا ہے جناب مجیبؔ[1] نے فتویٰ
کہ ہے حلال ہے تقویٰ حرام ہولی میں
ہوا ہے حضرت بیکلؔ[2] کا رنگ کیا، دیکھو!
زہے فروغ مئے لالہ فام ہولی میں
گلے ملو سر بازار جس سے چاہو شمسؔ!
ہمیشہ سے ہے یہ دستور عام ہولی میں

عید

ہر کسی کے مُنہ پہ ہے دیکھو! بشاشت عید میں
ہر طرف کو ہے مبارک اور سلامت عید میں

---

[1] ایک عالم جی۔ [2] ایک شاعر بے بدل

کیا نکل آئی ہے اس کافر کی صورت عید میں !

سانولی رنگت پہ ہے کیسی ملاحت عید میں !

بوسۂ شیریں لباں بھی ان کے آگے گرد ہے

دیکھئے چکھ کر سوئیوں کی حلاوت عید میں

کیوں نہ آزادی سے دادِ عیش دیں اہلِ صوم

مل گئی ہے ان کو آزادی کی نعمت عید میں

دیکھئے ! بچھڑے ہوؤں کو یوں ملاتا ہے خدا

تو نکل آئی ہے پھر ملنے کی صورت عید میں

دونوں ہاتھوں سے سمیٹوں کیوں نہ گنجِ حسن کو

مل گئی مفلس کو قسمت سے یہ دولت عید میں

دوستوں کی بے وفائی کا وہ کیا شکوہ کریں

دشمنوں سے بھی نہیں جن کو شکایت عید میں

ڈال دیں بانہیں گلے میں آتے ہی اس نے جو شمس
آ گئی اُس بت کو بھی آخر مروّت عید میں

رانچی

تپش میں بھی ہیں چمن لالہ زار رانچی میں
ہے آکے ٹھیر گئی کیا بہار رانچی میں؟

زمین صاف ہے سڑکیں ہیں آئینے کی طرح
ذرا نہیں کہیں گرد و غبار رانچی میں

کہاں یہ ہنڈرو[1] و جونا کہاں وہ رکنا باد!
ہے لطف بادہ سر آبشار رانچی میں

کنار آب نمایاں زمردیں کہسار
زہے سرور مے خوشگوار رانچی میں

[1] ہنڈرو اور جونا رانچی کے اطراف میں دو مشہور آبشار اور سیر گاہیں ہیں۔

ہمیں تو جام سفالیں ہی بس ہے اے ساقی!
نہیں ہے گر قدح زرنگار رانچی میں

یہاں جو آکے رہا چند روز، سرخ ہوا
غرض ہے آب و ہوا لالہ کار رانچی میں

نگاہ کو ہے طراوت، دماغ کو ہے سکوں
عجیب لطف کے ہیں سبزہ زار رانچی میں

یہاں کے دن بھی شب ماہ سے بہتر ہیں
نشاط و عیش کی ہے کیا بہار رانچی میں!

چھپا ہو دل میں تو ہو رخ پہ کچھ اثر ہی نہیں
عیاں نہیں ہے غم روزگار رانچی میں

کہو تو شمس منیری بھی آکے رہ جائیں
شکار و سیر کو ہیں کوہسار رانچی میں

۹

منیر شریف

درِ کرامت و اعجاز ہے منیر[1] شریف

حریم جلوہ گہِ راز ہے منیر شریف

دیارِ شرق میں وہ اوّلیں صدائے اذاں!

ہنوز گوش بر آواز ہے منیر شریف

موحدوں کی وہ مشرق میں پہلی جولانگاہ!

نشانِ راہِ تگ و تاز ہے منیر شریف

زمین گنج شہیداں ہے آج تک گلپوش

یہ کس کے خون سے گلباز ہے منیر شریف؟

---

[1] قصبہ منیر شریف۔ ضلع پٹنہ میں مغرب کی طرف بیس میل کے فاصلہ پر دریائے گنگا و سون کے سنگم (مقام اتصال) پر واقع ہے۔ اپنے آثارِ قدیمہ کے لے مشہور ہے۔

جناب مومن عارف[1] کے نور ایماں سے

نگاہِ شوق میں ممتاز ہے منیر شریف

شیوع دین بدست امام تاج فقیہ[2]

اسی کا نقطہ آغاز ہے منیر شریف

اسی میں دفن ہیں مخدوم احمد یحییٰ[3]

اسی سے مایۂ صد ناز ہے منیر شریف

اسی کی خاک سے اُٹھے تھے شیخ شرف الدین[4]

اسی شرف سے سرافراز ہے منیر شریف

---

[1] حضرت مومن عارف یمنی ثم منیری قدس سرہٗ جو سب سے پہلے پیغام توحید منیر میں لائے، اور وہاں کے راجہ کے ہاتھوں ستائے گئے، اس لئے ارض اسلام میں فریادی ہوئے، اور حضرت امام تاج فقیہؒ اور ان کی جماعت کے منیر میں آنے کا باعث ہوئے۔

[2] حضرت امام محمد تاج فقیہؒ سرتاج فقرائے اسلام، جن کے ہاتھوں منیر فتح ہوا اور وہاں علم توحید بلند ہوا۔ یہ حضرت مخدوم الملک کے جد اعلیٰ تھے۔

[3] حضرت مخدوم شیخ احمد یحییٰ منیری قدس سرہٗ حضرت مخدوم الملک کے والد ماجد۔ ان کا مزار بڑی درگاہ کہلاتا ہے۔

[4] حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری ثم بہاری قدس سرہٗ۔ ان کا مزار مبارک قصبہ بہار شریف پٹنہ سے تقریباً پچاس میل جنوب مشرق میں ہے۔

یہیں تھا مدرسۂ دین شیخ رکن الدین[1]
انہیں کے سوز سے دمساز ہے منیر شریف
یہیں ہے درگہ مخدوم شاہ دولت[2] بھی
انہیں کے فیض کا غماز ہے منیر شریف
جناب صوفی[3] و شمس حزیں کے نغموں سے
حریف دہلی و شیراز ہے منیر شریف

(۱۰)

پروانہ

پروانہ! تجھے یہ کیا ہوا ہے؟ تو کس کا طواف کر رہا ہے؟

---

[1] حضرت مخدوم شیخ رکن الدین مرغیلانی قدس سرہٗ حضرت مخدوم الملک کے استاد
[2] حضرت مخدوم شاہ دولت منیری قدس سرہٗ عہد شاہنشاہ اکبر میں عبدالرحیم خانخاناں اور ابراہیم خاں کاکر آپ کے مریدوں میں سے تھے۔ آپ کا مزار شریف چھوٹی درگاہ کہلاتا ہے اور مغلیہ فن تعمیر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔
[3] حضرت شاہ فرزند علی حبا منیری قدس سرہٗ المتخلص بہ صوفی۔ نہایت اچھے شاعر اور غالب کے معزز شاگرد۔

اس شمع میں روشنی ہے کس کی ؟ — دل میں ترے لو لگی ہے کس کی ؟

کیوں وقفِ صد اضطرار تو ہے ؟ — کس واسطے بے قرار تو ہے ؟

بیتابیٔ دل تری عیاں ہے — جذبے سے اُسی کے پرفشاں ہے

شورش سی یہ تیرے دل میں کیا ہے ؟ — سچ کہہ، ترے آب و گل میں کیا ہے ؟

یہ آخرِ شب، یہ وقتِ راحت — ہر چیز ہے مستِ خوابِ غفلت

چپ چاپ وحوش ہیں بھٹوں میں — خاموش طیور گھونسلوں میں

انسان بھی ہو گئے ہیں خاموش — بستر پہ پڑے ہیں کیسے مدہوش!

اک شمع کہ شمعِ انجمن تھی — رونق دہ محفلِ سخن تھی

تنہا کھڑی ٹمٹما رہی ہے — روتی ہوئی مسکرا رہی ہے

اک وہ ہے اور ایک تو ہی بیدار — تم دونوں میں کچھ تو ہے سروکار

یہ راز و نیاز تم میں کیا ہے ؟ — یہ سوز، یہ ساز تم میں کیا ہے ؟

کیوں دل ترا وقفِ صد تپش ہے ؟ — کیا شعلۂ شمع میں کشش ہے ؟

کیوں تجھ کو ہے اضطراب ایسا؟ ہے کس کے لئے خراب ایسا؟
کیوں رقص میں مست تو ہے پیہم؟ کیوں وجد کا ہر گھڑی ہے عالم
کیوں شعلہ پہ جان دے رہا ہے؟ پھر پھر کے بلائیں لے رہا ہے
کیوں سر کو لگن پہ مارتا ہے؟ کیوں شمع پہ جان وارتا ہے؟
کیوں آگ میں جی جلا رہا ہے؟ کیوں موت کے منہ میں جا رہا ہے؟
کیوں شمع کی لو کو چومتا ہے؟ کیوں آکے مرنے میں جھومتا ہے؟
آیا تو ہے شعلہ پر جھپٹ کر جل جائے گا آگ سے لپٹ کر
کیوں تجھ کو ہے اشتیاق سوزش؟ کیوں دل میں ہے یہ مذاق سوزش؟
کیا یہ ہی کمال زندگی ہے؟ سوزش ہی مآل زندگی ہے؟
ننھا سا وہ دل ترا کہاں ہے؟ جس سے تب و تاب یہ عیاں ہے

رکھ دے مرے سینے میں وہی دل
اپنا سا بنا دے مجھ کو بسمل

۱۱

شفق

شفق میں لال کہیں ہے کہیں ہے کالا رنگ
جدھر کو دیکھئے ہے اک نیا نرالا رنگ
کہیں ہے سُرخ، کہیں چمپئی، کہیں پیلا
کہیں کبود، کہیں سُرمئی، کہیں نیلا
کہیں ہے شوخ گلابی، کہیں ہے ہلکا سا
کہیں گلابی گہرا، کہیں کنول کا سا
کہیں ہے کاکل مشکیں کہیں عبیری ہے
کہیں سفید جو ہے وہ بیاض پیری ہے
کہیں یہ شوخ طلائی، کہیں یہ بھورا ہے
کہیں تمام ہے رنگیں، کہیں ادھورا ہے

۱۲

جنگل میں منگل

خدا جانے کشش کیسی ہے بند اچل پہاڑوں میں
کہ اٹکا ہے ابھی تک میرا دامن ان کے جھاڑوں میں

کبھی جاتی ہیں آنکھوں میں مری موزونیاں ان کی
پکڑ لیتی ہیں قدموں کو مرے محبوبیاں ان کی

پہاڑوں جنگلوں کی زندگی کا میں تو عادی ہوں
کہ بچپن ہی سے میں پروردۂ آغوش وادی ہوں

لڑکپن اور جوانی میری گذری کوہساروں میں
میں کھیلا ہوں بہت دن وادیوں کے آبشاروں میں

بچا ہوں بال بال اکثر میں سانپوں سے گھیروں سے
لڑی ہیں ناگہاں آنکھیں کبھی چیتوں سے شیروں سے

کبھی بھالو کو گولی مار کر میں نے گرایا ہے
کبھی سانبھر نے آہٹ پا کے میری غل مچایا ہے
کبھی موروں کو میں نے ناچتے جنگل میں دیکھا ہے
کبھی ہرنوں کو لڑتے دشت کے دنگل میں دیکھا ہے
کبھی پیڑوں کے سائے میں مزے سے سو گیا ہوں میں
کبھی جنگل کے رستوں میں اکیلا کھو گیا ہوں میں
کبھی جھرنوں کے نرمل جل سے پیاس اپنی بجھائی ہے
کبھی ستو بھی سانا ہے، کبھی کھچڑی پکائی ہے
لگی ہے بھوک جنگل میں تو جنگلی پھل بھی کھائے ہیں
شکار اکثر کیا ہے، اور کباب اکثر لگائے ہیں
مزے جو جنگلوں میں ہیں کہاں آبادیوں میں ہیں
کہاں پابندیوں میں لطف جو آزادیوں میں ہیں

۱۳

دِل کا کنول

نیند سے چونک اور پیاری! آنکھیں نہ مل

بھور کیسی سہانی ہے! ندی کو چل

کر لے اشنان، جلدی سے کپڑے بدل

او ربن ٹھن کے یوں سامنے سے نکل

آج کھل جائے پھر میرے دل کا کنول

سر پہ مٹکی دھری، اس میں گنگا کا جل

ہر قدم پہ وہ پتلی کمر کھائے بل

آہ! وہ چال جو چھین لے دل سے کل

ہاں! مجھے دیکھ کر اور اٹھلا کے چل

آج کھل جائے پھر میرے دل کا کنول

پھر دکھا دے ذرا اپنی بانکی ادا

وہ مجھے دیکھ کر منہ ترا پھیرنا

اور اوپر کے دل سے بگڑنا ترا

وہ ہنسی منہ پہ تیرے، وہ ماتھے پہ بل

آج کھل جائے پھر میرے دل کا کنول

گرمیوں کا سماں، چاندنی رات ہو

چاندنی رات میں پیار کی بات ہو

تو خوشی سے دیئے ہات میں ہات ہو

باغ میں میرے ساتھ اس طرح سے ٹہل

آج کھل جائے پھر میرے دل کا کنول

آج آجا ادائیں دکھاتے ہوئے

کچھ لجاتے ہوئے مسکراتے ہوئے

اور رکتے ہوئے ہچکچاتے ہوئے

یاد آجائے مِلنا وہ پہلے پہل

آج کھِل جائے پھر میرے دل کا کنول

(۱۴)

گرمیٔ محبّت

نہ اب رخسار میں میرے وہ رنگ گلستاں باقی

نہ اب آنکھوں میں میری وہ شرابِ ارغواں باقی

وہ اعضا کا تناسب اور وہ کس بل کہاں باقی

نہ اب میں ہوں حسیں باقی، نہ اب میں ہوں جواں باقی

مگر اب تک ہے تیرا مجھ پہ لُطفِ بیکراں باقی

بتا! تیری محبت میں ابھی تک کیوں یہ گرمی ہے؟

نکل کر باغ سے جنگل میں آوارہ ہوا ہوں میں

مصیبت کا، غم و اندوہ کا مارا ہوا ہوں میں
کشاکش زندگی ہے اور ناکارا ہوا ہوں میں
حیاتِ کامراں کی دوڑ میں ہارا ہوا ہوں میں
غبارِ راہ ہوں کیوں آنکھ کا تارا ہوا ہوں میں؟
بتا! تیری محبت میں ابھی تک کیوں یہ گرمی ہے؟

میں اس بازارِ دنیا میں متاعِ بمردہ ہوں گویا
میں اپنی زندگی سے آپ ہی آزردہ ہوں گویا
گذشتہ آگ کی خاکسترِ افسردہ ہوں گویا
مزارِ آرزو پر اک چراغِ مردہ ہوں گویا
مگر تیری وفاداری سے پاافشردہ ہوں گویا
بتا! تیری محبت میں ابھی تک کیوں یہ گرمی ہے؟

جوانی کا وہ خوابِ دلنشیں کیا یاد ہے اب تک!

تری چشمِ سیہ دل کے لئے صیّاد ہے اب تک
اداؤں سے تری اُف! دل مرا برباد ہے اب تک
نگاہِ ناز تیری کیوں ستم ایجاد ہے اب تک؟
مری اُلفت سے کیا سینہ ترا آباد ہے اب تک؟
بتا! تیری محبّت میں ابھی تک کیوں یہ گرمی ہے؟

مری گم گشتگی پر شور کیوں مچوا دیا تو نے؟
چھپا تھا دل میں گر اک داغ، کیوں دکھلا دیا تو نے
بتاؤں کیا کسی کو، کیا لیا اور کیا دیا تو نے
دبی چنگاریاں تھیں، ان کو پھر بھڑکا دیا تو نے!
تڑپ کر آپ ظالم! مجھ کو بھی تڑپا دیا تو نے!
بتا! تیری محبت میں ابھی تک کیوں یہ گرمی ہے؟

---

(۱۵)

رباعیات

ہر لالہ ہے پیمانۂ صہبائے حیات
ہر غنچۂ گل ہے مست مینائے حیات
ہر نخل میں جوشِ زندگی پنہاں ہے
ہر برگ کی ہے زباں پہ غوغائے حیات
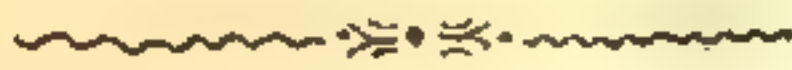
ہر ذرہ کے دل میں ہے تمنائے حیات
ہر برگِ گیاہ اک تقاضائے حیات
گر آنکھ نہیں تو خوردبیں سے دیکھو
ہر قطرہ میں موجزن ہے دریائے حیات

ہر ذرہ میں بج رہا ہے اک سازِ حیات
ہر قطرہ میں پوشیدہ ہے اعجازِ حیات
کٹتا ہے جو سر تو زندگی بڑھتی ہے
سیکھا ہے تجربے سے ہم نے یہ رازِ حیات

آساں نہیں اس جہاں میں اظہارِ حیات
کمزور سے اُٹھتا ہے کہیں بارِ حیات
ہے زندگی صرف سرفروشوں کے لئے
جاری ہے جہاں میں ایک پیکارِ حیات

ہو کیفِ حیات سر میں، پینا ہے یہی
دل میں ہو مئے خودی تو جینا ہے یہی

جینے کی ہوس نہ ہو یہ فطرت ہی نہیں
مرنے کا نہیں ہو خوف جینا ہے یہی

ہے آمد و شد سے اعتبار ہستی
چلتی ہوئی ہے راہ گذار ہستی
موجیں اُٹھتی ہیں اور فنا ہوتی ہیں
جاری ہے ہمیشہ جوئبار ہستی

کیا خوب ہیں یہ نقش و نگار ہستی
کیا شوخ ہے رنگ لالہ زار ہستی
سینچا ہے لہو سے اس چمن کو ہم نے
ہے خون سے رنگیں یہ بہار ہستی

ہر شخص کو ہے رنج خمار ہستی
بڑھتا ہے یہاں غم سے عیار ہستی
وہ ظرف عنایت ہو مجھے اے ساقی!
پی جاؤں میں جام ناگوار ہستی

اِنسان داغ عبودیت دھو نہ سکا
رویا، مگر اپنی عقل پر رو نہ سکا
کہتا ہے کہ "عالم یہ ہوا آپ سے آپ"
لیکن اللہ خود بخود ہو نہ سکا!

مسلم ہی نہیں ہیں جب تو ملحد ہے کون؟
مشرک ہے کون؟ اور موحد ہے کون؟

کہتے ہیں" خدا کو ہم نے اِیجاد کیا"
فرمایئے، پھر آپ کا موجد ہے کون؟

وہ غفلت روز و شب وہ مستی نہ گئی
وہ شام و سحر کی مے پرستی نہ گئی
مرتے کتنوں کو تو نے دیکھا اے شمسؔ
دل سے ترے آرزوئے ہستی نہ گئی

کیوں اشک سے آنکھوں کے پیالے ہیں بھرے؟
کیا فائدہ کوئی غم و اندوہ کرے؟
ہنس بول کے زندگی گذار و لے شمسؔ
اَوروں کے لئے وہ روئے جو خود نہ مرے

پتے کچھ سبز ہیں گلابی کچھ ہیں
کچھ پھول سفید ہیں شہابی کچھ ہیں
ہے ہر طرف اس چمن میں رنگا رنگی
کچھ اس میں ہیں پارسا شرابی کچھ ہیں
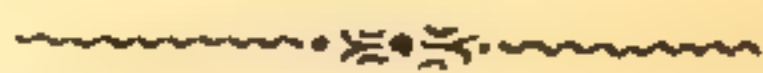
چڑھتے ہوئے دریا کی روانی دیکھو!
تا حد نظر پانی ہی پانی دیکھو!
ہر چیز کی ہوتی ہے جوانی اک وقت
برسات میں گنگا کی جوانی دیکھو!

ہم بمبئی سے سوئے اندھیری آئے
کرنے کو یہاں بھی ایک پھیری آئے

کیونکر نہ اندھیری میں اُجالا ہو جائے
لو ! آج یہاں شمسؔ منیری آئے

پیام و سلام

پیامِ گل زگلستاں بنام ما برسد
بود کہ باز بہ گلشن سلام ما برسد

نہادہ پا بہ رہ شوق و خود نمی دانیم
کہ تا کجا سفر نا تمام ما برسد

خوشا نصیب! کہ خدام را بفرماید
بیاورید بہ ما چوں غلام ما برسد

ہنوز مستئ ما پختگی نمی دارد
مگر ز لطف تو صہبائے خام ما برسد

نشستہ ایم بہ پائین بزم یارائے شمس
چگونہ بادۂ صافی بہ جام ما برسد

(شمس منیری)

۱

پیام

فصل گُل آئی ہے گلشن سے پیام آتا ہے
مژدہ اے اہلِ قفس! تم کو سلام آتا ہے

بلبلو! بادِ بہاری کا پیام آتا ہے
نامۂ لالۂ و گل نام بنام آتا ہے

بزمِ رنداں میں کمی دیکھ کے سوزِ دل کی
آج ساقی مرا پھر شعلہ بجام آتا ہے

آج پھر جمع ہیں محفل میں وہ رند اے ساقی!
پی کے اک جام جنہیں کیف دوام آتا ہے

راہ ہموار، نہ خم پیچ، نہ خطرہ کوئی
ہوشیار اہل سفر! سخت مقام آتا ہے

دیکھ اے دوست! ذرا تو بھی عروجِ مہِ نو

اک جہاں بھر تماشا سرِ شام آتا ہے

اہلِ سجدہ سے یہ کہہ دو کہ ابھی سر نہ اٹھائیں

اب بہت دیر نہیں، وقتِ قیام آتا ہے

فقر پر فخر ہے جن کو، وہ پریشاں کیوں ہیں؟

آفتابِ اہلِ دول کا لبِ بام آتا ہے

جال پھیلائے ہیں صیّاد نے ہر سو لیکن

طائرِ بامِ حرم کب تہِ دام آتا ہے

ہے مصیبت میں محمدؐ کا سہارا کافی

ایسے وقتوں میں یہی نام تو کام آتا ہے

دیر میں عمر گذاری ہے، مگر جانے کیوں

دل تڑپ جاتا ہے جب آپؐ کا نام آتا ہے

باب رحمت نہ کریں بند ابھی جلدی کیا ہے؟

ٹھیریئے ٹھیریئے سرکار! غلام آتا ہے

کاش! مل جائے اسے بھی عرفات مقصود

شمسؔ دل سوختہ اے اہل خیام! آتا ہے

(۲)

جدّہ

خود بخود غیب سے سامان ہوا جاتا ہے

ہر قدم پر ترا احسان ہوا جاتا ہے

یہ ترا لطف! یہ احسان! یہ عنایت! یہ کرم!

تیرا سائل ترا مہمان ہوا جاتا ہے

عافیت کے ہیں سب اسباب مہیا، لیکن

دل بے صبر پریشان ہوا جاتا ہے

رُخ ہے کعبے کی طرف، دل ہے مدینے کی طرف
اب مرا کفر بھی ایمان ہوا جاتا ہے

اُف! فرنگی مدنیت کے کرشمے، واللہ
اب تو جدّہ بھی پرستان ہوا جاتا ہے

دیکھ کر حالتِ اعراب ہر اک صاحبِ دل
شرم سے سر بگریبان ہوا جاتا ہے

ہر مسافر غمِ پنہاں سے "عیاذاً باللہ"!
اپنی محنت پہ پشیمان ہوا جاتا ہے

وہ ہے خود ارضِ مقدس کا ہی محافظ، ورنہ
غلبۂ کفر کا امکان ہوا جاتا ہے

ہو چکا شانِ جلالی و جمالی کا ظہور
جو تھا مشکل وہ آسان ہوا جاتا ہے

اپنی بسیار گناہی سے نہ گھبرائے شمسؔ
تیری بخشش کا بھی فرمان ہوا جاتا ہے

(۳)

خیمۂ لیلیٰ

تمہارے کوچے میں دیوانہ وار آ ہی گیا
دلِ ستم زدہ پھر[1] ایک بار آ ہی گیا

ترے حضور میں باندھا جو تھا بروزِ الست
پھر آج یاد وہ قول و قرار آ ہی گیا

کسی کے ناز پہ اپنی نیازمندی پر
دلِ غریب کو پھر اعتبار آ ہی گیا

کششِ یہ کس کی تھی اے ساربانِ ناقہ دوست؟
کہ پیچھے پیچھے میں بے اختیار آ ہی گیا

[1] بچپن میں والدین مرحومین کے ساتھ ایک دفعہ زیارت حرمین شریفین کا اتفاق ہو چکا تھا۔

نظر پڑا سگِ لیلیٰ کہیں جو رستے میں
نہ رُک سکا دلِ غم دیدہ، پیار آ ہی گیا

وہ سامنے نظر آتا ہے خیمۂ لیلیٰ!
قرار بخشِ دلِ بے قرار آ ہی گیا

اب اس کی لاج ترے ہاتھ ہے جو در پہ ترے
کوئی ستم زدۂ روزگار آ ہی گیا

ہو کیوں نہ رشک ہمیں اس کی خوش نصیبی پر
سُنا ہے شمسؔ غریب الدیار آ ہی گیا

۴

عرفات

کیا جلالِ دوست عرفے میں عیاں ہونے لگا؟[1]
محرمو! عرفات میں کیا امتحاں ہونے لگا؟

[1] امسال یعنی ۱۳۶۹ھ میں حج کے موقع پر عرفات میں جو طوفان برف و باد آیا تھا اس واقعہ کی تصویر کشی اس نظم میں کی گئی ہے

کیا یہ آمد ہے کسی طوفان برف و باد کی؟
کیوں غبار آلود اتنا آسماں ہونے لگا؟

کیوں یہ بادل کی گرج ہے، کیوں یہ بجلی کی کڑک؟
کیا نمایاں طور کا جلوہ یہاں ہونے لگا؟

یہ ہوائے تند! یہ بارش تگرگ و برف کی!
جس سے خستہ حال ہر پیر و جواں ہونے لگا

اُف! یہ خیموں کا اُکھڑنا اور گرنا ہر طرف!
اُف! یہ کیسا شور فریاد و فغاں ہونے لگا!
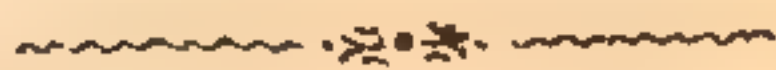
آہ! یہ باران رحمت ہے کہ اظہار عتاب؟
کیوں یہ دل کمبخت ناحق بدگماں ہونے لگا!

ایک ہی لمحے میں سارے دل ہوئے مشغول حق!

قطع اس دُنیا کا ہر بندِ گراں ہونے لگا!
چاک سب غفلت کے پردے یک بیک ہونے لگے
منہزم سب لشکرِ طاغوتیاں ہونے لگا
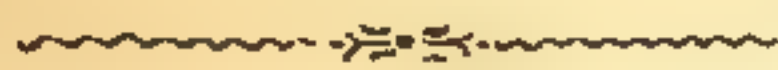
پھر نظر احرامیوں پر لُطف کی پڑنے لگی
جوش میں دریائے رحمت پھر رواں ہونے لگا
پھر درِ رحمت کھلے، پھر نور کی بارش ہوئی
آسماں سے پھر نزولِ قدسیاں ہونے لگا
اُف! یہ طوفانِ تبسّم در پسِ چینِ جبیں!
پھر سکونِ خاطرِ شوریدگاں ہونے لگا
شمس، بس اس عالمِ کیفِ نشاط و ذوق میں
سُوئے مزدلفہ رجبل کارواں ہونے لگا

۵

ذوق و شوق

حسرتِ دید ہے نہاں دل میں
شوق لیتا ہے چٹکیاں دل میں
اے رفیقو! چلو مدینے کو
طاقت صبر اب کہاں دل میں
جب تصوّر کیا مدینے کا
کھل گیا ایک گلستاں دل میں
رنگ پیری میں ہے جوانی کا
آرزو ہو گئی جواں دل میں
اس طرح سلسلہ ہے داغوں کا
نظر آتی ہے کہکشاں دل میں

کیا چھپائیں کسی سے راز دل

خود ہی بیٹھا ہے راز داں دل میں

ہو اگر حکم، لب تک آ جائیں

ہم چھپائے ہیں کچھ فغاں دل میں

آگ تو بجھ چکی ہے مدت سے

ابھی باقی ہے کچھ دھواں دل میں

اہل ایماں کا حال کیا کہئے!

اُف! نہیں طاقت بیاں دل میں

اور ہو بھی، تو کیسے لب تک آئے؟

کاش! ہوتی کوئی زباں دل میں

بے کہے آپ پر ہے سب ظاہر

شمس جو کچھ کہ ہے نہاں دل میں

۶

راہ مدینہ

آنکھوں کو مدینے کا جو رستا نظر آیا
اشکوں کا اُمنڈتا ہوا دریا نظر آیا

کیا کہیئے جو ہر ذرّہٗ صحرا نظر آیا
چمکا ہوا قسمت کا ستارا نظر آیا

بیتابِ رہِ شوق نہ تنہا نظر آیا
دل بن کے ہر اک ذرہ تڑپتا نظر آیا

ہر وادیٔ رہ وادیٔ ایمن کا نمونہ
ہر کوہچہ اک طورِ تجلّٰی نظر آیا

اللہ رے شادابی اطراف مدینہ!
ہر خارِ بن بادیہ طوبیٰ نظر آیا

اے ہمسفرو اصلّ علیٰ پڑھ کے بڑھے جاؤ

لو! سامنے وہ قبۂ خضریٰ نظر آیا

نخل رطب افشاں کے تلے بہر ضیافت

آراستہ خوانِ منّ و سلویٰ نظر آیا

پھر اس نے کبھی چشمۂ حیواں نہ کیا یاد

یثرب میں جسے چشمۂ زرقا نظر آیا

جنتّ[1] تھی عیاں روضۂ اطہر کے بغل میں

ہلکا سا فقط سامنے پردا نظر آیا

تھی دھوپ کی تکلیف نہ سائے کی طلب شمسؔ

دامانِ پدر دامنِ صحرا نظر آیا

---

[1] مابین بیتی ومنبری روضۃ من ریاض الجنّۃ (حدیث شریف)

دربارِ رسالت

دربار ترا اور شمس حزیں! اللہ غنی اللہ غنی!

آتا ہی نہیں ہے دل کو یقیں، اللہ غنی اللہ غنی!

یہ تیرے حرم کی ہے جو زمیں رکھتے تھے صحابہ جس پہ جبیں

کیونکر نہ ہو رشکِ عرش بریں، اللہ غنی اللہ غنی!

وہ جوشِ بحرِ فیضِ اتم، سیراب ہے جس سے اک عالم

جاری تھا یہیں وہ چشمۂ دیں، اللہ غنی اللہ غنی!

خلقت تری عظمت جان چکی، دنیا تری عزت مان چکی

اس پر بھی ہیں اعدا بر سرِ کیں، اللہ غنی اللہ غنی!

سب تیرے کرم سے پھیلا ہے، سب تیرے فیض کا صدقہ ہے

جو کچھ ہے جہاں میں دانش و دیں، اللہ غنی اللہ غنی

کیا قسمت ایسی ہماری ہی؟ یہ خواب ہے یا بیداری ہی؟[1]
دربار ترا اور شمس حزیں! اللہ غنی اللہ غنی!

۸

مینائے مدینہ

شراب محبت کا مینا مدینہ
نجات جہاں کا سفینا مدینہ
کہاں سے کوئی لائے اس کا مقابل
ہے دنیا انگوٹھی، نگینا مدینہ
یہیں ہم نے دیکھی ہے حق کی تجلّی
ہمارے لیے طور سینا مدینہ
اسی سے تو ہے جان جسم جہاں میں
ہے مکّہ اگر ناف، سینا مدینہ

[1] اینکہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب (حافظ)

بتاؤں تمہیں امن عالم کا مرکز ؟

مدینہ ، مدینہ ، مدینا ، مدینہ

یہیں سے پہنچنے کا رستا ہے واں تک

ہے جنّت اگر بام ، زینا مدینہ

وہی تو ہے دونوں جہانوں کی دولت

جو ہے دفن تجھ میں خزینا، مدینہ!

ترے شمس کو تیری رٹ تھی ہمیشہ

زباں پر تھا اس کی مدینا، مدینہ

۹

صلوٰۃ وسلام

اے بطحا کے رہنے والے! لائے ہیں دور سے ہم کچھ نالے
اذن وصول عطا ہو ان کو مُہر قبول عطا ان کو

صلی اللہ علیک وسلم
صلی اللہ علیک وسلم

خشک و تر پر راج ہے تیرا جن و بشر محتاج ہے تیرا
رہرو راہ اسریٰ تو ہے صاحب یثرب و بطحا تو ہے
وادی ایمن فاراں تجھ سے ریگستان بہاراں تجھ سے

صلی اللہ علیک وسلم
صلی اللہ علیک وسلم

بندوں کا مطلوب ہے تو ہی — اللہ کا محبوب ہے تو ہی

تیرا مقام محبوبیت — ہے وہ نبوت اور عبدیت

ختم رسل کی شان یہی ہے — اللہ کا احسان یہی ہے

صلّی اللہ علیک وسلّم

صلّی اللہ علیک وسلّم

اچھوں کا سرتاج ہے تو ہی — انسانوں کی لاج ہے تو ہی

تیرے دل میں درد جہاں کا — تو ہی دل ہے کون و مکاں کا

مسکینوں کو وقر تجھی سے — صاحب فخر ہے فقر تجھی سے

مزدوروں کا حامی تو ہے — ماحیٔ رسم غلامی تو ہے

صلّی اللہ علیک وسلّم

صلّی اللہ علیک وسلّم

نسلی نخوت تو نے مٹائی — رسم جہالت تو نے مٹائی

کالے، گورے، کمتر، برتر　　تیرے آگے سب ہیں برابر

عورت کا اعزاز بڑھایا　　حیواں کو انسان بنایا

رنگ محبّت سب پہ چڑھایا　　گھر کو جنّت تو نے بنایا

بیبیوں کا محبوب بنا تو　　بچّوں کا مطلوب بنا تو

خادم تیرے تجھ پر نازاں　　ساتھی تیرے تجھ پر قرباں

صلّی اللہ علیک وسلّم

صلّی اللہ علیک وسلّم

تو نے ایسی راہ دکھائی　　جو تھے دشمن بن گئے بھائی

مشتمل آئینِ فطرت　　تو نے سکھایا دینِ فطرت

تو نے رسمِ شرک مٹائی　　دنیا کو توحید سکھائی

سجدۂ غیر سے اس کو بچایا　　انساں کو خوددار بنایا

تو نے طلسم کاہن توڑا　　عبد و واحد کا رشتہ جوڑا

صلّی اللہ علیک وسلّم
صلّی اللہ علیک وسلّم

اُونچا حق کا نام تجھی سے — عزّت دینِ اسلام تجھی سے
عالمگیر یہ دین ہے تیرا — مصر و ہند و چین ہے تیرا
حق کا ڈنکا تو نے بجایا — باطل کو مٹّی میں ملایا
سب کے لئے ہے تیری نبوّت — ختم ہے تجھ پہ حق کی رسالت
تیری دعوت، دعوت محکم — تیرا مخاطب سارا عالم

صلّی اللہ علیک وسلّم
صلّی اللہ علیک وسلّم

دُنیا دُنیا تیری ہدایت — عالم عالم تیری رحمت
ہر عاصی پر تیری نوازش — ہر خاطی کو تجھ پہ نازش
شمسؔ حزیں ہے بندہ تیرا — کون نہیں ہے بندہ تیرا؟

تیرے بندے اور یہ حالت! — اے واقسمت! اے واقسمت!

ہم پہ زمیں اب تنگ ہی مولا! — دُنیا بر سرِ جنگ ہے مولا!

اے یثرب میں سونے والے! — اُمّت عاصی کے رکھوالے!

ایک نظر رحمت کی، ہم پر — شافعِ محشر! شافعِ محشر!

اے حق کی کشتی کے کھوّیا! — ڈگمگ ہے اُمّت کی نیّا

ہاتھ ذرا دو چار لگا دے — اپنا بیڑا پار لگا دے

صلّی اللہ علیک وسلّم

صلّی اللہ علیک وسلّم

(۱۰)

مزارِ حضرت سیّدنا امام حسین علیہ السّلام پر

پروردۂ آغوشِ نبی، نیک خصال — یعنی حسنؓ و حسینؓ زہراؓ کے لال

مصداقِ تَخَلَّقُوا بِاَخلاقِ اللہ — حق کا اِن میں جمال اور اُن میں جلال

(۱۱۱)

وداع

ہم مدینے سے جو بادیدۂ گریاں نِکلے
"چاک دل ، چاک جگر، چاک گریباں نکلے"
یوں تری بزم سے ہم سوختہ ساماں نِکلے
لالہ ساں داغ بدل، شعلہ بداماں نِکلے
نہ تو سر پیر کی سُدھ بدھ نہ بجا ہوش و حواس
تیرے دل باختہ باحال پریشاں نکلے
خاک اُڑاتے ہوئے جاتے ہیں بصد حسرت و یاس
چھوڑ کر لطف چمن اہلِ گلستاں نکلے
گرد اس شہر کی اپنے لئے ہے خاک شفا
ہم مدینے سے لئے درد کا درماں نِکلے

تیرے سائل کہیں کیا جائیں کہ شاہانِ جہاں

لاکھ سامان پہ بھی بے سر و ساماں نکلے

اب تو کفّار بھی چلتے ہیں تری راہوں پر

تیرے منکر عملاً تیرے ثنا خواں نکلے

دلِ روشن کو نہیں بادِ شبِ تار سے خوف

لے کے ہم یاں سے چراغِ تہِ داماں نکلے

اتنا تھا ظرف کہاں، مانگتے ساقی سے کچھ اور

ہو کے اک جرعہ میں مستِ مئے عرفاں نکلے

درِ اقدس سے چلے دولتِ دارین لئے

کون کہتا ہے کہ ہم بے سر و ساماں نکلے

دکھنا! فرقتِ حضرت میں بجائے گوہر

شمسؔ آنکھوں سے تری لعلِ بدخشاں نکلے

(۱۲)

ارضِ حجاز

وہ دلفریبیٔ ارضِ حجاز کیا کہیے

ہے ذرہ ذرہ وہاں جاں نواز کیا کہیے

وہ ریگ و سنگ پہ، اہلِ ذوق مقناطیس

وہ دل کشیٔ نشیب و فراز کیا کہیے

طلوعِ صبح سے وہ تلبیے، وہ تکبیریں

سکوتِ شب کا وہ راز و نیاز کیا کہیے

جہاں مجاز اک آئینۂ حقیقت ہے

وہاں حقیقتِ رنگِ مجاز کیا کہیے

وہ پائے شوق کی وحشت خرامیاں واللہ!

سمٹ گئی رہِ دور و دراز کیا کہیے

وہ باغہائے ثمر، اور وہ ہجوم نخیل
فضائے یثرب دیدہ نواز کیا کہیے

وہ خوابگاہ نبوت، وہ گنبدِ خضرا
وہ اس کا جلوہ نزہت طراز کیا کہیے

وہ مسجد نبوی، وہ حریم خاص رسول
نماز، اور وہاں کی نماز! کیا کہیے

نکل کھڑا ہوا گھر سے جو شخص بے سر و پا
کرشش یہ کس کی تھی بندہ نواز! کیا کہیے
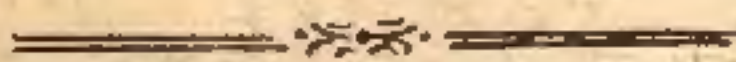
(۱۳)

سَلام

روانہ ہوتا ہے اب سوئے بمبئی یہ جہاز

سَلام سَاحلِ جدہ! سلام ارضِ حجاز!

سلام دشت و بیاباں! سلام اے کہسار!

سلام نیرِ توحید کے تجلی زار!

سلام نورِ ازل سے طپیدہ ریگستاں!

سلام یثرب و بطحا! سلام اے فاراں!

سلام منزلِ مِنیٰ[1] و عرصۂ عرفات!

سلام رہ گذرِ عاشقاں و راہِ نجات!

سلام مروہؔ و کوہِ صفا! سلام! سلام!

سلام وادیٔ اُمّ القُریٰ! سلام! سلام!

---

[1] بوجہ دید محاورہ میں منیٰ کو مِنیٰ کہتے ہیں۔

ناشر:-

آزاد پریس - سبزی باغ - پٹنہ

ملنے کا پتہ:-

اقبال بک ڈپو - بیر بہور - ڈاکخانہ مہندرو - پٹنہ ۶